اہل حرم کی رقت انگیز داستانیں

نقش کربلا

قائد اہل سنت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ

تحقیق و تخریج

ڈاکٹر غلام زرقانی قادری

وارثِ علومِ اعلیٰ حضرت نبیرۂ حجۃ الاسلام جانشین مفتیٔ اعظم ہند جگر گوشہ مفسرِ اعظم شیخ الاسلام والمسلمین قاضی القضاۃ تاج الشریعہ

حضرت علامہ مفتی الشاہ محمد اختر رضا خان قادری ازہری علیہ الرحمہ

اور خانوادۂ اعلیٰ حضرت کے دیگر علمائے کرام کی تصنیفات اور حیات و خدمات کے مطالعہ کے لئے وزٹ کریں

Waris e Uloom e Alahazrat, Nabirah e Hujjat ul Islam, Janasheen e Mufti e Azam Hind, Jigar Gosha e Mufassir e Azam Hind, Shaikh ul Islam Wal Muslimeen, Qazi ul Quzzat, Taj ush Shariah Mufti

Muhammad Akhtar Raza Khan

Qadiri Azhari Rahmatullahi Alihi

Or Khaanwada e Alahazrat k Deegar Ulama e Kiram Ki Tasneefat Or Hayaat o Khidmaat k Mutaluah k Liyae Visit Karen.

To discover about writings, services and relical life of the sacred heir of Imam Ahmed Raza, the grandson of Hujut-ul-Islam, the successor of Grand Mufti of India, his Holiness, Tajush-Shariah, Mufti

Muhammd Akhter Raza Khan

Qadri Azhari Rahmatullahi Alihi

the Chief Islamic Justice of India, and other Scholars and Imams of golden Razavi ancestry, visit

www.muftiakhtarrazakhan.com

Taaj-al-Shari'ah Foundation, Karachi, Pakistan.

تاج الشریعہ فاؤنڈیشن

0092 303 2886671 /makhtarraza1011

اہل حرم کی رقت انگیز داستانیں

نقشِ کربلا

قائد اہل سنت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ

تزئین وتصحیح

ڈاکٹر غلام زرقانی قادری

نام: نقش کربلا

مصنف: قائد اہل سنت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ

تصحیح: ڈاکٹر علامہ غلام زرقانی قادری

اڈیشن: اول

تاریخ: اکتوبر، ۲۰۱۸ء

پبلشر: دار الکتاب، مٹیا محل، جامع مسجد دہلی، 011-23243186

کتاب ملنے کا پتہ:

دار الکتاب، ۴۲۱ مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی

کتب خانہ امجدیہ، ۴۲۵ مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی

مکتبہ جام نور، ۴۲۲ مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی

قادری کتاب گھر، اسلامیہ مارکیٹ، بریلی

رضوی کتاب گھر، جامع مسجد، دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ

ونصلی علی رسولہ الکریم

وعلی آلہ

وصحبہ اجمعین

نقش کربلا

شرفِ انتساب

کربلا کے شہیدوں

کے نام

جنہوں نے اپنے خون سے اسلامی شریعت کی حفاظت فرمائی

غلام زرقانی قادری

قُلْ لَّآ أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا

إِلَّا الْمَوَدَّةَ

فِى الْقُرْبٰى

(الشوریٰ، آیت:۲۳)

اے محبوب مکرم!

آپ کہیے کہ مجھے دعوت واصلاح کے عوض تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہیے،

ہاں یہ کہ تم قرابت داری کی محبت سلامت رکھو

قال النبی صلی الله علیه وسلم :

یاایها الناس،

انی ترکت فیکم ماان اخذتم به لن تضلوا:

کتاب الله ، وعترتی اهل بیتی

(ترمذی، رقم الحدیث:۳۷۸۶، ج:۵،ص:۶۶۲)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا:

اے لوگو! میں تمہارے درمیان وہ چھوڑے جارہاہوں،

جسے تم تھامے رکھوگے،تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے؛

کتاب الٰہی اور میری عترت، اہل بیت

مشمولات

☆☆☆☆

☆☆

☆

ابتدائیہ

مجھے نہیں معلوم کہ ''نقش کربلا'' کی پہلی اشاعت کب ہوئی تھی، تاہم کتاب دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قائد اہل سنت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے چند ایسے مضامین کا یہ مجموعہ ہے، جو واقعہ کربلا کے حوالے سے ہے، نیز اس میں عالمی شہرت یافتہ ماہنامہ ''جام نور'' کالکوتہ، کے شہید کربلا نمبر میں آپ کے زرنگار قلم سے لکھے ہوئے تنقیدی شذرات بھی شامل کر لیے گئے ہیں، جو امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقائے سفر پر کیچڑ اچھالنے اور یزید پلید کی حمایت میں دیوبندی فرقہ کے چند شر پسند قلم کاروں نے شائع کیے تھے۔

آپ یہ جان کر حیران رہ جائیں گے کہ مؤخر الذکر موضوع پر جب کتاب لکھی گئی، تو دیوبندی مسلک کے اکابرین اور زعمائے جماعت نے کلمات تحسین سے نوازا، لیکن جب انہیں یہ احساس ہو گیا کہ برصغیر ہند و پاک میں اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین سے محبت کرنے والے مسلمان بہت زیادہ ناراض ہو رہے ہیں، تو یزید پلید کی حمایت سے اپنا دامن جھاڑنے کی ناکام کوششیں کرنے لگے۔ تاہم قائد اہل سنت علیہ الرحمہ کی عقابی نگاہوں سے ان کی دورنگی کیوں کر چھپ سکتی تھی، اس لیے انہوں نے ناقابل انکار دلائل وشواہد کے سہارے انہیں وہیں لا کھڑا کیا ہے، جس کے وہ حق دار ہیں۔

ظاہر ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین سے محبت ایمان والوں کے لیے سرمایۂ افتخار ہے اور اس میں کسی بھی جہت سے ڈاکہ ڈالنے کی کوشش نا قابل برداشت ہے۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی حفاظت کے لیے ہمیں جو نصیحت فرمائی، اس میں بھی اہل بیت سے محبت کا تذکرہ کیا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم عرفہ کے دن اپنی اونٹنی ''قصواء'' پر سوار تھے اور فرما رہے تھے:

'' یاایھا الناس، انی ترکت فیکم ما ان اخذتم به لن تضلوا: کتاب الله وعترتی اهل بیتی ''(۱)

''اے لوگو، میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، جب تم انہیں تھامے رہوگے، تو کبھی بھی ضلالت وگمراہی تمہارے قریب نہیں آسکے گی؛ کتاب الٰہی اور میری عترت، میرے اہل خانہ''

بہر کیف، یہ کتاب عرصہ دراز سے چھپتی رہی اور ہاتھوں ہاتھ نکلتی بھی رہی۔ افسوس ہوتا ہے کہ والد گرامی علیہ الرحمہ کی دوسری کتابوں کی طرح، اس کتاب میں بھی کتابت کی بہت غلطیاں در آئی تھیں، حتی کہ دسیوں مقامات پر عربی عبارات میں بھی کہیں تو چند کلمات چھوٹ گئے اور کہیں الفاظ اس طرح باہم گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ افہام وتفہیم ہی دشوار ہو گئی۔ میں نے اصل کتاب سے از سر نو دیکھ کر انہیں درست کر دیا ہے۔ اس طرح مجھے امید ہے کہ یہ ایڈیشن پہلے سے کہیں زیادہ اہل علم کے نزدیک پسند کیا جائے گا۔

مجھے یہ کہتے ہوئے بے پناہ مسرت ہو رہی ہے کہ فخر صحافت ڈاکٹر چاند نظامی، سب ایڈیٹر ''اخبار مشرق'' نے اس کتاب کے لیے ایک وقیع مقالہ مجھے عنایت کیا۔ خیال رہے کہ ڈاکٹر چاند نظامی نے والد گرامی قائد اہل سنت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ پر ونوبا بھاوے یونیورسٹی ہزاری باغ سے پی ایچ ڈی کی ہے۔ موصوف نے قائد اہل سنت علیہ الرحمہ کی حیات

۱۔ ترمذی، ج:۵، ص:۶۶۲، رقم:۳۷۸۶

وخدمات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ ڈاکٹر چاند نظامی نے صرف سامنے دکھائی دینے والے حقائق اور سنی سنائی باتوں پر اپنے مقالے کی بنیاد نہیں رکھی، بلکہ تحقیق وجستجو کا حق ادا کرتے ہوئے قائد اہل سنت علیہ الرحمہ کے علوم وفنون، تصانیف وتالیفات، افکار وخیالات اور آپ کے ہاتھوں سے روئے زمین پر بسائے ہوئے دینی وعصری اداروں، مساجد اور تنظیمی سرگرمیوں سے کماحقہ معرفت حاصل کرنے کے لیے دردر کی خاک چھانی ہے اور ہمیں ایسا مرقع عطا کیا ہے، جو قائد اہل سنت علیہ الرحمہ کی ذات گرامی اور ان کی خدمات کو سمجھنے کے لیے بہت کافی ہے، بلکہ یوں کہیے کہ موصوف نے پوری جماعت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔ پچھلے دنوں جناب نے مجھ سے رابطہ کر کے یہ خوشخبری دی کہ ان کا تحقیقی مقالہ بنام ''علامہ ارشد القادری: حیات وخدمات''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے طبع ہو کر علمی حلقوں میں پہنچ گیا ہے۔ اس اشاعت پر، میں انہیں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دیتا ہوں۔

اسی کے ساتھ قائد اہل سنت علیہ الرحمہ کی نثر نگاری اور اچھوتے اسلوب بیان کے حوالے سے جناب ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مضمون بھی شامل اشاعت کر دیا ہے، جو ''جام نور'' کے رئیس القلم نمبر میں شائع ہوا تھا۔

ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی علیہ الرحمہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے، تاہم قائد اہل سنت علیہ الرحمہ کی بارگاہ علم وادب میں ان کی عقیدتوں کے خراج کے چند اقتباسات اس کتاب کا حصہ بناتے ہوئے مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ خیال رہے کہ ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی علیہ الرحمہ اہل علم کے درمیان ایک بلند پایہ محقق اور ذمہ دار مصنف کی حیثیت سے عالمی شہرت رکھتے ہیں، خصوصیت کے ساتھ امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کی بلند پایہ شخصیت اور ان کے علوم وفنون کی گہرائی وگیرائی کے تعلق سے موصوف نے نہایت ہی قیمتی قلمی اثاثہ ہمارے درمیان چھوڑا ہے، نیز برطانیہ کے نومسلم ڈاکٹر محمد ہارون کی متعدد انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر کے انہیں زیور طبع سے آراستہ کیا اور اردو داں حلقے کے لیے استفادہ آسان کر دیا۔ اس طرح آپ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر موصوف صاحب نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، ان کے اجالے سے ہماری علمی، دینی اور سماجی محفلیں رہتی دنیا تک منور رہیں گی۔

بہر کیف، یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔احباب کوئی کمی محسوس کریں،تو مجھے مطلع فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں،تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اسے درست کیا جاسکے۔

میں دل کی گہرائیوں کے ساتھ اپنی اہلیہ عالمہ نزہت زیبا قادری سلمہا اللہ تعالیٰ کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس کی پروف ریڈنگ کی اور مناسب مشورے بھی دیے۔اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کریم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے سب کی خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے۔آمین

خیراندیش

ڈاکٹر غلام زرقانی قادری

(جانشین قائد اہل سنت)

۲۹ ربیع الاول ۱۴۴۰ ہجری

علامہ ارشد القادری کی نثر نگاری

ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی، بریلی شریف

اردو نثر و نظم کی نشو ونما اور فروغ وارتقا، صوفیا وعلما ہی کی رہین منت ہے اور آج بھی حلقہ مذہب اور اولیا وصوفیا کے ماننے والے صاحبان علم وقلم اردو کی بقا وتحفظ کے ساتھ اسے فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

نثر اردو نے اپنی ابتدا سے لے کر بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک مذہبی وتقدیسی ادب کے توسط سے ہی گرانقدری اور وقار و جمال حاصل کیا، لیکن آج محسنین اردو میں اللہ کے ان نیک دل بندوں اور علم وقلم کی مملکت کے ان تاجوروں کا ذکر ہی نہیں اور اگر کہیں کسی کا ذکر ملتا بھی ہے، تو بس برائے نام!

دراصل قوموں اور ملکوں کی تواریخ کی طرح اردو زبان وادب کی تاریخ کا دامن بھی تعصب اور تنگ نظری سے پاک نہیں ہے۔ زبان وادب کی تاریخ میں عصبیت کی لہراتی ہوئی سیاہ پرچھائیاں سچائی کے اجالے کو ڈستی نظر آرہی ہیں اور آسمان تاریخ ادب وزبان پر قمر درعقرب کا گھناؤنا منظر پیش کر رہی ہیں۔ ہاں، ایک مخصوص فرقہ کے مذہبی نثر نگاروں کو ضرور بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے اور قصر اردو کا انہیں ستون مانا گیا ہے، یعنی سرسید اور ان کے رفقا بالخصوص اردو کے عناصر اربعہ، محمد حسین آزاد، حالی، نذیر وشبلی۔ ویسے عقیدہ ومسلک سے قطع نظر

ان نثاران اردو نے بلاشبہ اردو کو نکھارنے، سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، مگر جنہوں نے ان سے بڑھ کر اردو کی آرائش وزیبائش کا سامان فراہم کیا ہے، اردو کو تب وتاب اور توانائی عطا کی ہے، انہیں یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

امام احمد رضا فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہ نے اردو کو مختلف علوم وفنون کے مصطلحات، سینکڑوں ضرب الامثال ومحاورات کا جو گرانقدر سرمایہ عطا کیا ہے، اردو نثر کو بھانت بھانت کے علوم وفنون کے جہانوں کی سیر کرائی ہے، اسالیب سے آشنا کیا ہے اور پچاس سے زائد دینی ونقلی اور دنیوی وعقلی علوم وفنون پر کئی سو کتب ورسائل عطا کیے ہیں، ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

رام بابو سکسینہ نے ''تاریخ ادب اردو'' میں ایک مقام پر صرف اس طرح امام احمد رضا فاضل بریلوی کا ذکر کیا ہے، جس سے ہمارے قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں:

''مولوی احمد رضا خاں بریلوی کے بعض رسائل بھی جو بہت پر جوش لہجے میں لکھے گئے تھے، اس وقت نکلے اور ندوہ کے مقابلے پر ایک جنگجو جماعت جروہ قائم کی گئی، جس کے اجلاس کلکتہ میں ہوئے تھے۔''(۱)

اسی طرح قومی آواز کے بک سیلر اور پبلشرز نمبر ۱۹۸۲ء لکھنو، میں تیکھے انداز میں امام احمد رضا بریلوی کا ذکر ہوا ہے۔ اور ''تحفہ حنفیہ'' پٹنہ کو رضا خانی آرگن لکھا گیا ہے۔

خیر اس تعصب اور تنگ نظری اور مورخین ادب کی اندھیر نگری سے قطع نظر یہ عرض ہے کہ تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کے جو اہم قلم کار اور انشا پرداز ابھر کر سامنے آئے، مذہبی یا غیر مذہبی حلقہ سے، جن کی قلم کاری اور انشا پردازی کی دھوم ہے، ان میں بہت ہی نمایاں، معتبر اور مستند نام قائد اہل سنت علامہ ارشد القادری صاحب دامت برکاتہم العالیہ کا بھی ہے۔

رب عظیم نے حضرت علامہ کو گوناگوں خوبیوں سے نوازا ہے۔ آپ بیک وقت جید عالم دین، معلم واستاذ، عدیم المثال مناظر، عظیم خطیب، مہتمم ومنتظم، عالی دماغ مفکر ومدبر اور بے پناہ قائدانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں، قلم کا تو جواب ہی نہیں، زمانہ آپ کو ''رئیس القلم'' اور ''رئیس التحریر'' کے القابات سے یاد کرتا ہے۔

۱۔ تاریخ ادب اردو، ص: ۶۹، نثری حصہ

آپ کا قلم اہل محبت پر گلاب، یاسمن، بلکہ بہاروں کا شباب لٹاتا ہے اور اہل عداوت اور اعدائے دین پر خنجر خونخوار اور برق بار بن کر لپکتا ہے۔ ''زلزلہ'' لکھ کر نجد سے دیوبند تک زلزلہ برپا کر دیتا ہے اور ''زیروزبر'' تصنیف کر کے دنیائے بدمذہبیت کو لوٹ پوٹ کر کے رکھ دیتا ہے۔ آپ صحافی بھی ہیں اور ادیب ومصنف بھی، ناقد ومبصر بھی ہے، شارح وشاعر بھی۔

علامہ کے مقالات ومضامین کی طرح، ان کے مکاتیب بھی بے شمار ہیں، تاہم فی الحال، ان کی فراہمی ابھی دشوار ہے۔ لہذا زیر نظر مقالہ میں علامہ کی چند تصانیف، جن میں ایک دوان کے مضامین کے مجموعوں پر مشتمل ہیں، ان کے توسط سے ان کی انشا پردازی کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

ناقدین نے اردو نثر کو چار اقسام پر تقسیم کیا ہے؛ توضیحی نثر، بیانیہ نثر، تأثراتی نثر اور شخصی نثر یا انانیتی نثر۔

ہم انہیں آسانی کے لیے دو حصوں پر تقسیم کرتے ہیں:

۱۔ توضیحی نثر

۲۔ تخلیقی نثر (بیانیہ، تأثراتی اور انانیتی نثر، تخلیقی نثر کے تحت آتے ہیں)

مثالیں ملاحظہ فرمائیے؛

۱۔ دیوبندی صاحبان نبی کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب اور اختیارات وتصرفات کے منکر ہیں اور ایسا عقیدہ رکھنے والے ان کے نزدیک مشرک ہیں، مگر خود اپنے دیوبند کے مولویوں اور پیروں کے لیے انہیں باتوں کو جائز قرار دیتے ہیں۔ دیکھیے، ان کی کس طرح علامہ صاحب گرفت فرماتے ہیں:

> '' بتائیے! اب اس ان کہی کو کیا کہا جائے۔ یہ معمہ تو گیلانی صاحب اور ان کی جماعت کے علما ہی حل کر سکتے ہیں کہ جو فاصلہ مکانی ان حضرات کے نزدیک انبیا اور سید الانبیا تک پر حائل رہتا ہے، وہ نانوتوی صاحب پر کیوں نہیں حائل ہوا؟
>
> اور مولوی یعقوب صاحب کی غیبی قوت ادراک کا کیا کہنا کہ انہوں

نے تو دیو بند میں بیٹھے بیٹھے مولوی قاسم صاحب نانوتوی کی وہ غیبی توجہ تک معلوم کرلی، جو انہوں نے میرٹھ سے ان کی طرف مبذول کی تھی.....لیکن شرم سے منہ چھپالیجیے کہ گھر کے بزرگوں کا تو یہ حال بیان کیا جاتا ہے اور رسول مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اسی جماعت کا عقیدہ یہ ہے۔''(۱)

اس کے بعد''حفظ الایمان'' کا حوالہ دیتے ہوئے مزید تبصرہ فرماتے ہیں:

''اب اس بے وفائی کا انصاف تو رسول عربی کی وفادار امت ہی کرے گی کہ خود تو یہ حضرات آن واحد میں سینکڑوں میل کی مسافت سے دلوں کی مخفیات پر مطلع ہو جاتے ہیں، لیکن رسول انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک ماہ کی طویل مدت میں کسی مخفی امر کے انکشاف کی قوت تسلیم نہیں کرتے۔ کیا اتنی کھلی ہوئی شہادتوں کے بعد بھی حق وباطل کی راہوں کا امتیاز محسوس کرنے کے لیے مزید کسی نشانی کی ضرورت باقی رہ گئی ہے؟ محشر کی تپتی ہوئی سرزمین پر رسول عربی کی شفاعت کے امیدوارو، جواب دو!''(۲)

مندرجہ بالا اقتباس میں مندرجہ ذیل خوبیاں موجود ہیں:

وضاحت، استدلال، ترتیب، متانت، ایجاز واختصار اور جملہ اسلوب کی طرح داری، طنز کی نمک پاشی.......اور ادبیت کا حسن ملاحظہ:

'' کیا اتنی کھلی ہوئی شہادتوں کے بعد....رسول عربی کی شفاعت کے امیدوارو، جواب دو۔''

۲۔ ایک دیوبندی پیر صاحب کے تصرف کے حوالہ سے علامہ کی یہ تحریر ملاحظہ کریں:

''غور فرمائیے، یہاں بات کتنی آگے نکل گئی ہے۔ وہاں تو صرف اس الزام پر کفر کا فتویٰ تھا کہ فلاں شخص کی بیماری دور کرنے کی نسبت کیوں

۱۔ زلزلہ، ص: ۴۸

۲۔ نفس مصدر، ص: ۵۰

کی گئی، اور یہاں شخص نہیں، شخص کے مدفن کی مٹی کو لوگ دافع امراض سمجھ رہے ہیں، تو انہیں نہ کوئی روکنے والا ہے اور نہ کفر کے ارتکاب پر کوئی توبہ کرانے اور کلمہ پڑھانے کی ضرورت محسوس کرتا ہے، آخر یہ کیسا کفر ہے، جو سب کے گلے کا ہار بنا ہوا ہے۔

اور اس واقعہ میں مسلک کا دردناک قتل تو یہ ہے کہ جب مٹی ڈالتے ڈالتے صاحبزادے تنگ آگئے تو مٹی میں شفا کی جو قوت تھی، اسے واپس لینے کے لیے خدا کی طرف رجوع کرنے کے بجائے سیدھے باپ کی قبر پہ حاضر ہوئے اور دھمکی دی کہ اب کے کوئی اچھا ہوا، تو ہم مٹی نہ ڈالیں گے۔ بیٹے کا یہ عمل کیا ان کے اس عقیدے کی پردہ دری نہیں کرتا کہ مٹی کے اندر شفا بخشی کی یہ تاثیر خدا کی طرف سے نہیں، بلکہ ماں باپ کی طرف سے تھی۔ اس لیے ضابطہ کے مطابق ان کے عقیدے میں جس نے تاثیر بخشی تھی، سلب کرنے کی درخواست بھی اسی سے کی۔ اور واقعۃً بھی ایسا ہی ہوا کہ ادھر صاحبزادے صاحب باپ کی قبر پر دھمکی دے کر گئے، ادھر یکلخت مٹی کی تاثیر بھی بدل گئی اور لوگوں کا آنا بھی موقوف ہو گیا۔"[1]

اس اقتباس میں وضاحت، استدلال، ترتیب و سلیقہ مندی، متانت، فراست اور ایجاز و بلاغت کے باوصف طنز کا وہ اندازہ بھی دیکھیے، جو تحریر کو ملاحت عطا کرتی ہے اور جس کا ردو تعاقب کیا جاتا ہے، یہ نمک پاشی اس کے لیے نشتر سے کم نہیں ہوتی۔ اسی سے متعلق چند مختصر پیراگراف اور ملاحظہ فرمایئے:

"سوال یہ ہے کہ مٹی کے بارے میں شفا بخشی کا عقیدہ لے کر ان کی قبر پر لوگوں کا میلہ لگانا، اگر از روئے شرع کفر تھا، تو امت کو کفر سے بچانے کے لیے صاحب قبر نے پہلے ہی وہ کام کیوں نہیں کر دیا، جسے بیٹے کے اصرار پر بعد میں انہیں کرنا پڑا۔

---

[1] ۱۔ زیر و زبر، ص: ۲۴۰، ۲۴۱

اور دوسرا سوال یہ ہے کہ نانوتہ کچھ اجمیر نہیں تھا، جہاں حریفوں کی زبان میں بدعت وشرک کو پروان چڑھنے کی مکمل آزادی ہے، بلکہ وہ نجد کے موحدین کا وہ خطہ تھا، جہاں کسی قبر کے سامنے صرف ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہی تازیانے برسنے لگتے ہیں۔

آخر صحابہ اور اہل بیت کے مزارات کو ڈھادینے والے نانوتوی صاحب کی قبر پر اتنا بڑا شرک کیسے دیکھتے رہے؟ بالفرض اپنا سمجھ کر اگر مزار نہیں توڑا جارہا تھا، تو مشرکین کا سر توڑنے میں کیا مضائقہ تھا؟

اب آپ ہی دوٹوک فیصلہ کریں کہ کفر وشرک کے سوال پر اپنے بزرگوں کی اتنی کھلی ہوئی پاسداری کے بعد بھی کیا دیوبندی علما اپنے سر سے یہ الزام اٹھا سکتے ہیں کہ ان کے یہاں دو طرح کی شریعتیں نہیں ہیں؟ ''١

یہ اقتباس نثر خالص کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ طنز ونشتر کا متین وملیح نمونہ بھی ہے، جو انشائیہ کی سرحد کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس اقتباس میں ''خطابت'' کا بھی ایک اچھوتا انداز ہے۔ موازنہ نگاری'' نانوتہ کچھ اجمیر نہ تھا..... بلکہ وہ نجد کے موحدین کا وہ.....آخر صحابہ اور اہل بیت کے مزارات کو ڈھادینے والے .....توڑنے میں کیا مضائقہ تھا، وغیرہ تلمیحات کا بھی اچھا استعمال ہے۔

تخلیقی نثر

انشا پردازی کا کمال، اسلوب کی طرحداری، زبان کی لطافت، بیان کی دل کشی اور قلم کا جوہر اس نثر میں آتا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

١۔ ''وہ وقت بڑا ہی رقت انگیز اور کیف آور تھا، جب یا نبی سلام علیک کا نورانی نغمہ جیل کی فصیلوں سے ٹکرایا اور ساری فضا معطر ہوگئی۔ عشاق پر کچھ ایسی کیفیت طاری تھی کہ دل وفا پیشہ نے باور کرلیا کہ سرکار نے اپنی امت کے اسیروں کا سلام ضرور قبول کرلیا ہوگا۔'' ٢

١۔ زیر وزبر، ص:٢٣٦

٢۔ زیر وزبر، ص:٩

۲۔ ''عنایت خداوندی کی وہ کتنی ارجمند گھڑی تھی، جب ''زلزلہ'' نام کی ایک کتاب لکھنے کا خیال دل میں پیدا ہوا۔کون جانتا تھا کہ روشنائی کے چند قطرے سیل رواں بن کر اہل باطل کے مزعومات کو خس وخاشاک کی طرح بہالے جائیں گے اور نوک قلم کا ڈالا ہوا شگاف ہمیشہ کے لیے دشمن کے سینے کا ناسور بن جائے گا۔ اور پھر کسے معلوم تھا کہ ایک مختصر سی کتاب دیکھتے ہی دیکھتے بحر و بر کی وسعتوں میں پھیل جائے گی اور ایک چراغ کی لو سے ایمان وعقیدت کے شبستانوں میں لاکھوں چراغ جل اٹھیں گے۔'' ۱

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات حسن تحریر کے نفیس نمونے ہیں ۔ دونوں بیانیہ نثر کی خوبصورت مثالیں ہیں۔

پہلے اقتباس میں منظر نگاری بہت خوب ہے۔ ''دل وفا پیشہ'' کی ترکیب بھی نہایت ہی شاندار ہے، جب کہ دوسرا اقتباس، بیانیہ اورانانیتی نثر کا اعلی نمونہ ہے۔ مبالغہ نے تحریر کی دل کشی میں اضافہ کر دیا ہے۔ خطابت اس اقتباس کی جان ہے، ''کون جانتا تھا.....دشمن کے سینے کا ناسور بن جائے گا، وغیرہ بلاغت سے پر جملے ہیں۔

نثر میں شعریت اور شعری فضا کا اہتمام

سرکار مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ پاک کی زیارت روح ایمان اور دنیا وآخرت کی جملہ سعادتوں کی جان ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ارشاد فرمایا: ''جو میری قبر کی زیارت کرے، اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی''۔ دوسری حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں: ''جس نے حج کیا اور میرے وصال کے بعد میری زیارت کی تو گویا اس نے میری زندگی میں زیارت کی اور جو مسلمان حرمین میں فوت ہوا، وہ قیامت کے دن امن والوں میں اٹھے گا''۔ تیسری حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں: جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی، اس نے میرے اوپر ظلم کیا۔''

۱۔ زیروزبر، ص: ۱۱

اب آئیے متذکرہ موضوع سے متعلق علامہ کی تحریر ملاحظہ کیجیے:

ا۔''انتظار کرتے کرتے اب وہ مسعود گھڑی آہی گئی، جب عشاق کے قافلے مدینہ کی طرف روانہ ہورہے ہیں۔آہ، پوچھنا کیا ہے دل کی مسرتوں کا عالم!مدینے کا رخ کرتے ہی آرزوؤں کے چمن میں بہار آگئی، امیدوں نے پھول برسائے، شوق نے چراغ جلایا، خوش بختیوں نے آواز دی اور ارمانوں کا کارواں کعبہ مقصود کی طرف بڑھنے لگا۔ منزل پہ منزل بدل رہی ہے، ریگستانوں کے طویل فاصلے گھٹ رہے ہیں، پہاڑیوں اور وادیوں کا دامن سمٹتا جارہا ہے۔

اب بے آب وگیاہ پہاڑیوں کا سلسلہ ختم ہوا۔اب یہاں سے مدینہ کی سرحد شروع ہوگئی۔ زمین ناز کررہی ہے۔ آسمان فخر سے سراونچا کررہا ہے۔موسم بدل گیا۔اب فضاؤں میں مستی ہے۔ہواؤں میں خنکی ہے۔ نظاروں میں دلکشی ہے۔ ہر طرف سبزہ زاروں کی بہار ہے۔ریگستانوں کا اجڑا ہوا چہرہ بھی اب کسی کے فیضان قدم سے لالہ زار ہے۔یہ دیار حبیب ہے، رحمت وجمال کی راجدھانی۔ بے تابی شوق میں قافلہ بڑھتا رہا یہاں تک کہ مدینہ قریب آگیا۔خبر ملی کہ سامنے والے پہاڑ پر چڑھنے کے بعد سبز گنبد نظر آئے گا۔'' ا

۲''اس کی نوک قلم کا ایک ایک قطرہ فکر واعتقاد کی جنتوں میں کوثر وتسنیم کی طرح بہہ رہا ہے۔اس کے خون جگر کی سرخی سے ویرانوں میں دین کے گلشن لہلہا اٹھے ہیں۔اس کے عرفان وآگہی کی داستانیں چمن چمن میں پہنچ گئی ہیں اور لوح وقرطاس سے گزر کر اب اس کے علم ودانش کا چراغ کشوردل کے شبستانوں میں جل رہا ہے۔'' ۲

ا۔آیئے حج کریں،ص:۴۵۔۴۶

۲۔لالہ زار،ص:۱۴۶

پہلے اقتباس میں علامہ محترم نے متذکرہ بالا تین احادیث کریمہ کے ترجموں کو عبارت میں بڑی خوبصورتی سے ضم کیا ہے۔اس کے بعد جس والہانہ انداز میں جذبات کا اظہار کیا ہے اور منظر نگاری میں جو جان ڈالی ہے، محاکات اور پیکر تراشی کے جو حسین جلوے پیش فرمائے ہیں، وہ شاعری کا ایک مرقع ہے۔اس اقتباس میں شعری فضا کا اہتمام بھی ہے اور بھرپور شعریت بھی۔

اسی طرح دوسرے اقتباس میں عاشق مصطفیٰ، امام احمد رضا بریلوی کی عظمت کا جو جلوہ دکھایا ہے، اس کا عالم ہی عجیب ہے۔رنگین بیانی کے ساتھ صداقت کا اچھوتا اعتراف، بس ایسا لگتا ہے کہ رضا کے قلم وقلب میں رچی بسی عشق رسالت مآب علیہ السلام کو پیکر محسوس میں ڈھال کر نگاہوں کے سامنے اس طرح لاکر رکھ دیا ہے، جیسے آسمان پر چودھویں کا چاند جلوہ گر ہو گیا ہے۔

تشبیہ واستعارے کے بہت ہی کم استعمال اور مبالغہ کی آمیزش کے بغیر انشا کا ایک ایسا حسن کم ہی ادیبوں کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔دراصل علامہ کے نثر کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں فکری قوت اور منطقی توانائی کے ساتھ ساتھ لطف اور اثر بہت شدید ہوتا ہے۔وہ فکر کے خاکوں میں تخیل کا رنگ بھر کر نثر کو باغ کامرانی کا سدابہار پھول بنادیتے ہیں۔

انشاپردازی کا حسین انداز

افسانہ نویس فرضی کہانی گڑھتا ہے اور اس میں بیانیہ نثر اور اپنے اسلوب کی طرح داری، اپنی رنگین بیانی وغیرہ سے کام لے کر حسن وتاثیر برپر کرتا ہے، حالانکہ یہ افسانے زمین ہی سے جڑے ہوتے ہیں، نیز انسانی دنیا اور انسانی ماحول کے قصے اور واقعات ہوتے ہیں، لیکن علامہ ارشد القادری افسانے نہیں گڑھتے، بلکہ حقیقی واقعات کو اپنے قلم کی سحر کاری سے افسانوی زبان وبیان میں اس طرح سامنے لاتے ہیں کہ حقیقت کا کوئی بھی گوشہ کسی طرح آلودگی کے بغیر اپنا وہ روپ دکھاتا ہے کہ نگاہیں جلوؤں میں گم ہو کر سچائی کے ایک ایک تاباں وتوانا زاویہ کی زیارت سے محظوظ ہوتی ہیں اور ایمان وعقائد کا جہان نور آباد ہو جاتا ہے۔

علامہ ارشد القادری کی نثر ادب برائے ادب بھی ہے، ادب برائے زندگی بھی ہے اور ادب برائے بندگی بھی۔

اس حوالے سے چند اقتباسات ملاحظہ کریں:

ا۔ کمشنر کی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ ہزاروں لالہ رخون اور زہرہ جمالوں کی کہانیاں اس کی ایک ایک ادا میں سمٹ آئی تھی۔ سرشار آنکھوں سے شراب کے پیانے چھلکتے، مہتاب کی طرح درخشاں پیشانی ہر وقت موج نور میں غرق رہتی، چلی تو فتنہ محشر جگاتی، باتیں کرتی تو پھول جھڑتے۔ جمال ورعنائی اور حسن ودلکشی کا وہ ایک ایسا مجسمہ تھی کہ مغربی تہذیب کے گھرانے میں بھی ہر وقت وہ پردے میں رہتی۔'' ا

۲۔ بچی کیا تھی، حسن وزیبائی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ایک مورت تھی۔ جو دیکھتا، حیران وششدر رہ جاتا۔ سارے شہر میں بجلی کی طرح یہ خبر مشہور ہوگئی کہ سنار کے گھر میں آسمان کی زہرہ اتر آئی ہے۔'' ۲

۳۔'' ذرا دیکھیے، یہ کالی گھٹاؤں کی طرح کاکل، یہ چاند کی طرح درخشاں پیشانی، یہ نور کی موجوں میں نکھرا ہوا چہرہ، یہ پروئے ہوئے موتیوں کی طرح دانتوں کی قطار، یہ پھولوں کی پنکھڑی کی طرح پتلے پتلے ہونٹ، یہ گلریز تبسم، یہ گہربار تکلم، یہ رحمتوں کا سویرا، یہ سرگیں آنکھیں، یہ معصوم اداؤں کا چشمہ سیال۔ بتایئے، کیا یتیموں کی یہی سج دھج ہوتی ہے؟ خبردار آج سے میرے ان جگر پاروں کو جو یتیم کہے گا، میں اس کا منہ نوچ لوں گی۔'' ۳

ا۔ لالہ زار، ص:۱۳

۲۔ نفس مصدر، ص:۱۰۴

۳۔ نقش کربلا، ص:۸۵

۴" قرآن کی جلالت شان سے سمندر کا کلیجہ دہل گیا اور توحید الٰہی کی سطوت جلال سے فضا بوجھل ہوگئی۔ اب نوجوان کی آواز دم بدم تیز ہوتی جارہی تھی۔ ایک صف شکن مجاہد کی طرح ہاتھوں میں قہر الٰہی کی تلوار لیے ہوئے، وہ دیو کو ہلاک کرنے پر تل گیا تھا۔" ۱

مندرجہ بلا اقتباسات قوس وقزح کی طرح چمکتے دمکتے اپنا اپنا رنگ اور اپنی چھاپ دکھارہے ہیں۔ ہر رنگ بذات خود ایک دھنک اور ہر چھاپ، دل کش ورعنائی کا جہان ہے۔

پہلے، دوسرے اور تیسرے اقتباسات، سراپا نگاری کے ایسے آئینے ہیں کہ شخصیات اپنے حقیقی حسن و جمال اور خدوخال کے ساتھ ساتھ، باطنی خوبصورتی اور نورانیت کے آئینہ خانے میں اتر آئے ہیں۔ اور چوتھے اقتباس میں خطابت، آہنگ اور جمالیاتی اظہار کے حسین و باوقار امتزاج نے نثر کو جمال وجلال کے سنگم پر لا کھڑا کیا ہے، جس میں اسلوب کی طرحداری لائق دید ہے۔

طنز وتعریض اور جوش بیان

علامہ ارشد القادری نے باطل پرستوں کا ردو تعاقب زبان سے بھی کیا ہے اور قلم سے بھی۔ اور اسی تنقید وتعریض کے حوالے سے آپ نے طنز کے تیز ابی و ملیح اظہار کے تیکھے وسلونے روپ پیش کیے ہیں۔ رد و تنقید اور گرفت و تعاقب کے مرحلے میں موقع محل کی مناسبت سے علامہ موصوف کے بیان کا جوش وزورد یکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے کوئی دریا رواں دواں ہے یا بجلی کوندتی لپکتی چلی جارہی ہے۔

اس پس منظر میں چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔" اسی کا نام اگر دینی تبلیغ ہے کہ کھلے بندوں مسلمانوں کی دل آزاری کی جائے، تو خدا محفوظ رکھے اپنے بندوں کو اس نحوست سے۔" ۲

۱۔ لالہ زار، ص: ۲۴۵

۲۔ شریعت، ص: ۱۰

۲۔ ''بھکو بازوں ہی کی زبان میں انہیں گفتگو کرنی تھی، تو انہیں کس نے کہہ دیا کہ وہ کتاب کے مصنف یا مذہبی پیشوا کی حیثیت سے مسلمانوں کے سامنے تشریف لائیں اور دینی پیشوائی کے منصب کو بدنام کریں۔ پیٹ کا ایندھن جمع کرنے کے لیے اور بھی بہت جائز طریقے ہیں۔''[۱]

۳۔ '' معاذ اللہ، عقیدت کا خمار بھی کتنا ایمان شکن ہوتا ہے۔ یہی مولانا عامر عثمانی ہیں، جنہیں ایمان کے سائے میں بھی شرک کے صنم خانے نظر آتے ہیں اور جن کے عقیدے میں اللہ والوں کی چوکھٹ پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتے ہی سو برس کا ایمان غارت ہو جاتا ہے، لیکن قیامت ہے کہ وہی مولانا مودودی کے آستانۂ عظمت پر دن کی روشنی میں سجدۂ نیاز لٹا رہے ہیں اور ان کے عقیدۂ توحید کو ذرا ٹھیس بھی نہیں لگتی ہے۔''[۲]

مندرجہ بالا اقتباسات سے علامہ ارشد القادری صاحب کا طنز و تعریض کا شائستہ انداز واضح ہے۔ طنز لطیف اور کھنک پیدا کرتے ہوئے نشتر علامہ کے خطیبانہ اسلوب کی غمازی کر رہے ہیں۔ اس اسلوب میں موازنہ نگاری بھی ہے، تنقید کے روشن زاویے بھی ہیں اور استفہام و بیان کا جوش و زور بھی پورے شباب پر ہے اور ان سب کے باوصف وضاحت و استدلال اور ایجاز و بلاغت بھی۔

انشائیہ نگاری

انشائیہ نگاری ایک خاص اور جدا اسلوب ہوتا ہے۔ اس میں انشائیہ نگار شگفتہ بیانی کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کے ہلکے پھلکے نشتر بھی چلاتا ہے۔ علامہ ارشد القادری صاحب کی تصانیف میں کہیں کہیں انشائیہ کے اچھوتے نمونے ملتے ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ کیجیے۔

۱۔ شریعت، ص: ۱۸

۲۔ جماعت اسلامی، ص: ۵۴

۱۔'' جب میں ان کے قریب پہنچا توان کی داڑھی اور پیشانی کا گھنا دیکھ کر ہکابکا رہ گیا۔ میں نے اپنی ساری عمر میں اتنی لمبی داڑھی اور پیشانی کی سطح پر ایسا ابھرا ہوا داغ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت تپاک سے میری طرف بڑھے اور میرا راستہ روک کر انتہائی لجاجت کے ساتھ کہنے لگے :حضت ، یہی ہے تبلیغی جماعت کا وہ مرکز ، جہاں سے ساری دنیا میں اسلام پھیل رہا ہے۔'' ۱

۲۔'' یہ علاقہ میوات کے نومسلم لوگ ہیں .....اب یہ لوگ شب و روز مرکز میں رہ کر دین سیکھتے ہیں ۔ جب یہ پکے ہو جائیں گے ،تو اپنا علاقہ خود سنبھال لے گے۔

بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ لوگ سالہا سال سے پارہ عم پڑھ رہے ہیں اور تبلیغی جماعت والوں نے اپنی دکان میں انہیں نمونے کے مال کی طرح سجا کے رکھا ہے۔ باہر سے آنے والوں کو سب سے پہلے یہی مال دکھایا جاتا ہے تاکہ دماغ پر پہلا امپریشن اتنا زوردار ہو کہ ذہن مرعوب ہو کے رہ جائے۔'' ۲

مندرجہ بالا اقتباسات میں تبلیغی جماعت کا چہرہ دکھایا گیا ہے۔علامہ نے اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تبلیغی جماعت کے باطنی روپ کو اس طرح گرفت میں لے کر پیش کیا ہے کہ شعور انسانی اپنے مدار سے ایک قدم باہر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔اور طنز لطیف کا حسن بھی پوری طرح جلوہ گر ہے۔

تأثراتی اور شخصی نثر

تأثراتی نثر سے مراد وہ نثر ہے، جس میں مصنف یا انشاپرداز اپنے گرد و پیش کے ماحول پر تأثرات پیش کرتا ہے ۔ بیانیہ نثر اور افسانوی ادب میں تأثراتی نثر کی بڑی اہمیت ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔تبلیغی جماعت ،ص ۲۵
۲۔نفس مصدر، ص:۲۶

۱۔ ''جوں ہی لاش نکالنے کے لیے تابوت کا تختہ کھولا، ملا جی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ لوگ حیرت سے ان کا منہ تکنے لگے۔ بڑی مشکل سے حواس پر قابو پانے کے بعد لوگوں کو بتایا کہ لاش بدل گئی ہے۔ ہم لوگوں نے غلطی سے دوسری قبر کا تابوت نکال لیا ہے ...قبر کا نیا پن بھی بتا رہا تھا کہ یہ بالکل تازہ قبر ہے۔'' ۱

۲۔ ''ترچنا پلی کے احباب کی دعوت پر میں نے ۱۹۶۹ء میں جنوبی ہند کا سفر کیا۔ واپسی میں حیدر آباد میں ایک دن کے لیے قیام کرنا پروگرام میں شامل تھا۔ اس لیے بنگلور ہوتے ہوئے سکندر آباد میل سے میری واپسی ہوئی۔ بدقسمتی سے یہ وہ زمانہ تھا، جب کہ تلنگانہ کی تحریک بالکل شباب پر تھی۔ ریاست کے بہت بڑے حصے میں مظاہرین نے ایک آگ سی لگا رکھی تھی۔ شہری زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہو کے رہ گیا تھا۔ رات کے وقت میری ٹرین اس علاقہ سے گزر رہی تھی، جو تخریب کاروں کا بہت بڑا مرکز تھا کہ اچانک ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ سارے مسافر سکتے کی حالت میں اٹھ پڑے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آگے لائن اکھاڑ دی گئی ہے۔ تقریباً اٹھارہ گھنٹے تک لائن کی مرمت کے انتظار میں ہم لوگوں کو وہاں رکنا پڑا۔'' ۲

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات بیانیہ نثر کے ساتھ ساتھ تأثراتی نثر کے بھی اچھے نمونے ہیں۔ پہلے اقتباس میں علامہ ارشد القادری صاحب نے ملا جی کے ذریعہ گرد و پیش کے تأثرات پیش کرائے ہیں اور دوسرے اقتباس میں خود اپنے سفر کے حوالے سے اپنے تأثرات پیش فرمائے ہیں۔

۱۔ لالہ زار، ص: ۲۷

۲۔ تبلیغی جماعت، ص: ۳۲

شخصی نثر

اسے انانیتی نثر بھی کہتے ہیں۔ سرسید نے اسے ایگو سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اس میں قلم کار اپنی انا کا اظہار کرتا ہے، لیکن دینی و مذہبی حوالے سے حلقہ مذہب کا انشاپرداز اپنے بارے میں کسی بڑائی کا اظہار کرتا ہے، تو باطل کی شکست کے حوالے سے اور اسے وہ تحدیث نعمت کے طور پر ظاہر کرتا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو۔

> ''زلزلہ کا یہی وہ ردعمل تھا، جس نے پوری دیوبندی جماعت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، یہاں تک کہ زلزلہ کی زد سے اپنے عوام کو بچانے کا سوال ارباب حل وعقد کے لیے اتنا سنگین ہوگیا کہ ایک بار مدیر تجلی فرط اضطراب میں اپنے چارہ گروں کو یوں للکارنے پر مجبور ہوگئے۔''[1]

خلاصہ کلام

صرف چند صفحات میں علامہ ارشدالقادری کی نثر نگاری اور انشاپردازی کے جائزہ کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ افسوس، اس طرف ابھی تک توجہ نہیں دی گئی، لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ذاتی طور پر علامہ کی نثری خدمات کا بھرپور جائزہ پیش کیا جائے اور یونیورسٹی سے باقاعدہ ریسرچ ورک کا فریضہ انجام دلایا جائے۔[2]

علامہ ارشدالقادری ایک صاحب طرز ادیب انشاپرداز ہیں اور اردو کے نامور اور اہم انشاپردازوں میں ایک انفرادی شان کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔

۱۔ زیروزبر، ص: ۱۸

۲۔ الحمدللہ اب تک علامہ ارشدالقادری علیہ الرحمہ کی حیات وخدمات پر دو پی ایچ ڈی ہو چکی ہے۔ ایک ڈاکٹر چاند نظامی صاحب نے ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ سے اور دوسری علامہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے مگدھ یونیورسٹی گیا سے کی ہے، جب کہ مولانا ہاشم رضا نے جواہر لال یونیورسٹی سے علامہ ارشدالقادری علیہ الرحمہ پر ایم فل کا مقالہ لکھا ہے۔ (ڈاکٹر غلام زرقانی)

علامہ ارشدالقادری کی قصہ گوئی

ڈاکٹر محمد چاند نظامی
آر پکھی اسکول پولس لائن، ہزاری باغ

قصہ کہنا اور سننا، انسانی فطرت و جبلت میں داخل ہے۔ اس کی ابتدا وہیں سے ہوتی ہے، جب انسان مدنیت و عمرانیت کے پہلے زینے پر تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کا جنت میں خوشۂ گندم کو ہاتھ لگانا اور آدم وحوا کا زمین پر اتارا جانا بہ ذات خود ایک قصہ ہے۔ اس طرح کے حقیقی واقعات کے ساتھ ساتھ بعض تخیلی قصے جو انسانیت کی طفولیت میں خلق کی گئی تھیں، آج بھی مذہبی و تاریخی کتب میں موجود ہیں۔ زبور، انجیل اور توریت کے علاوہ وید، اپنشد، پران، ویرانگ، وتری پٹک اور بودھی جاتک وغیرہ اس کی نظیر ہیں۔ قرآن کریم میں بھی کئی قصے بیان کیے گئے ہیں، جو عہد قدیم کے حقیقی واقعات پر مشتمل ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

"فاقصص القصص لعلھم یتفکرون" [1]

(کہانیاں کہتے رہو کہ لوگ کچھ تو غور وفکر کریں)

قرآن کریم میں بیان کردہ قصص سے جو حقائق ابھرتے ہیں، ان کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں:

۱۔ سورۂ اعراف، پارہ:۹، آیت:۱۷۶

''(۱) دعوت حق سے انحراف اور رسولوں کی تکذیب و تنقیص اور ان کے تمرد و سرکشی کا انجام کتنا عبرتناک اور ہلاکت خیز ہوتا ہے، اس کا اندازہ قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط، قوم نوح اور بنی اسرائیل پر مسلط کئے جانے والے قہر و عذاب کے واقعات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

(۲) کفار و مشرکین کی ذلت و ہزیمت اور انبیائے کرام کی فتح و نصرت کے واقعات سے اس امر کا یقین واثق ہو جاتا ہے کہ اس عالم میں کوئی بالاتر ہستی ضرور ہے، جو پردۂ غیب سے باطل کی تذلیل اور حق کی سرفرازی کے اسباب فراہم کرتی ہے۔

(۳) ظاہری قوت و حشمت اور اقتدار کی سطوت و جبروت سے داعیان حق کو ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ خدائے قادر و قیوم کی ذات پر کلی اعتماد ہو تو بے سرو سامانی کے باوجود بڑے بڑے متکبرین کا غرور خاک میں مل سکتا ہے۔

(۴) مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا عقیدہ واہمہ کا تصرف نہیں، بلکہ وہ ایک ایسی زندۂ جاوید حقیقت ہے، جس کی تصویر واقعات کے آئینہ میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

(۵) سچائی پر لاکھ پردہ ڈالا جائے، وہ ایک نہ ایک دن اجاگر ہو کر رہتی ہے، ظالم کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، مظلوم کا صبر اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اخلاص کی آزمائش کا وقفہ طویل ہو سکتا ہے، لیکن ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ محسنین کا اجر ضائع ہو جائے۔'' ۱

قرآن کریم کے اسی مزاج کی تقلید میں مولانا جلال الدین رومی نے ''مثنوی معنوی''، علامہ عبدالرحمٰن جامی نے ''تحفۃ الاحرار''، شیخ سعدی نے ''گلستاں و بوستاں'' اور فرید الدین عطار نے ''منطق الطیر'' وغیرہ میں قسم قسم کی حکایات و قصص بیان کیے، جو آج بھی فارسی ادب کے شہ پارے ہیں۔

علامہ نے بھی نوجوان نسل کی ذہن سازی اور کردار و افعال کی درستگی کے لیے تاریخی واقعات کو قصوں کے پیرائے میں بیان کیا، کیونکہ انہیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ:

''انسان فطری طور پر قصص و حکایات سے دلچسپی رکھتا ہے....... اس فطری خواہش سے جنگ کرنے کے بجائے اسے صحیح رخ پر لگا دینا وقت کا مفید ترین اقدام ہے۔ تجربہ شاہد

۱۔ لالہ زار، ص: ۶،۷

ہے کہ ایک ہی بات جو براہ راست درس و پیغام کے انداز میں کہی گئی، عام طبیعتیں اس سے مانوس نہیں ہو سکیں، لیکن وہی بات جب کہانی کے سانچے میں ڈھل گئی، تو حلق کے نیچے اترنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔" ۱

چنانچہ قصہ نگاری کے سلسلے میں وہ ایک واضح نظریہ رکھتے تھے، جس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان تاریخی کہانیوں کی اشاعت سے میرے دو مقاصد تھے؛

پہلا مقصد یہ تھا کہ ہاتھوں میں ایمان افروز، روح پرور اور پاکیزہ کہانیوں کا لٹریچر دے کر ان نوجوانوں کا ذہن بدلا جائے، جو گندی ناولوں اور شہوت انگیز افسانوں کو پڑھ کر اپنا وقت بھی برباد کرتے اور اپنی قیمتی صلاحیت بھی، اور زندگی غلط رخ پر لگ جانے کے بعد مستقبل کی تباہی کا جو بھیانک انجام ہے، وہ اس کے علاوہ ہے۔

اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ جن مسلمانوں کو دینی کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور وہ اپنی بد ذوقی کی وجہ سے مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے محروم ہیں، انہیں حکایات کی زبان میں دین سے روشناس کرایا جائے۔" ۲

اس سے واضح ہے کہ قائد اہل سنت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی قصہ گوئی کا مقصد ذہنی و نفسیاتی خواہشات کی تسکین نہیں، بلکہ اصلاح معاشرہ و عقیدہ تھا۔ وہ خلوص و محبت، ایثار و قربانی، خدمت و اطاعت، شرم و حیا اور عفت و پاکدامنی جیسے جواہر کے حصول کی اپنے قصوں میں بار بار تلقین کرتے ہیں، حالانکہ فن قصہ نویسی کے اعتبار سے اس طرح کی تعلیم و تلقین اور وعظ و پند زیادہ پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا، لیکن علامہ علیہ الرحمہ جس تحریک سے وابستہ تھے، وہاں فن سے زیادہ مقصد عزیز ہوتا ہے اور وہ اسے ایک مقدس فرض سمجھتے ہیں۔ ان کے قصوں میں پلاٹ وغیرہ کی اتنی اہمیت نہیں ہے، جتنی ذہنی انشراح کی ہے۔

۱۔ بزبان حکایت، مرتب ڈاکٹر غلام زرقانی، ص:۲

۲۔ لالہ زار، ص:۸/۹

یہی سبب ہے کہ ان کے قصے عقائد کی تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں۔ ''بہ زبان حکایت'' کے 23 میں سے 21 قصے احادیث اور صحیح کتب تواریخ میں بیان کردہ واقعات پر مشتمل ہیں، جبکہ ''لالہ زار'' کی بھی بیشتر کہانیاں اسلام کی معزز و معتبر ہستیوں سے منسوب ہیں۔ لہٰذا ان کہانیوں کے کردار زندہ و جاوید کردار ہیں اور وہ ایمانی حرارت سے لبریز اور ذوق شہادت سے سرشار نظر آتے ہیں۔ ہزار مصائب و آزمائش کے باوجود ان کے پائے استقلال میں ذرہ برابر بھی لرزش نہیں آتی، وہ نصرت خداوندی کی غیبی قوتوں پر اعتماد کے ساتھ حصول خیر کی جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔ ملک شام کے نوجوانوں نے بادشاہ روم کے شاہی منصب کی پیشکش کو صرف اس لیے ٹھکرا دیا کیونکہ اس کے نتیجے میں انھیں ایمان و اسلام سے ہاتھ دھونا پڑتا، لہٰذا انھوں نے ہنستے مسکراتے شہادت کی موت قبول کر لی (کہانی پاکدامن نوجوان) اور اسپین کے خدا پرست نوجوان نے صرف اپنی ایمانی قوت کی بدولت اس اندھے اعتقاد سے پورے جزیرے کے لوگوں کو نجات دلا دیا، جس کے تحت ہر سال ایک خوبصورت حسین لڑکی کو سمندر کی نذر کر دیا جاتا تھا (کہانی چودھویں رات کی دوشیزہ)۔

اسی طرح ان کہانیوں کے نسوانی کردار بھی نہایت توانا اور جاندار ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی عزت و حرمت کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگا دیتی ہیں، بلکہ اسلام پر اپنا سب کچھ نچھاور بھی کر دیتی ہیں۔ دیکھیے ایک بیوہ صرف اس لیے حسرت و غم کی تصویر بنی ہوئی ہے کہ آج اسلام پر قربان کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی نوجوان بیٹا نہیں ہے، حالانکہ وہ غزوۂ بدر میں اپنا سہاگ لٹا چکی ہے، لیکن اس کا اسے چنداں ملال نہیں۔ اس حقیقی تصور کی تصویر کھینچتے ہوئے علامہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''ماں نے کہا: بیٹا ضد نہ کرو، دل کی چوٹ تم ابھی نہیں سمجھ سکتے، میں اپنے نصیب کو رو رہی ہوں، کاش! آج میری گود میں بھی کوئی نوجوان بیٹا ہوتا تو میں اپنا نذرانہ شوق لیے رحمت عالم کی بارگاہ میں حاضر ہوتی۔

افسوس! کہ آج آخرت کے سب سے بڑے اعزاز سے محروم ہو گئی۔'' 1

1- کہانی، پیکر وفا

یونہی حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کی شریک حیات کا شادی کی پہلی رات میں ہی اپنے شوہر کو میدان جنگ کی اجازت دے دینا، ان کی کمال جرأت اور اسلام کے تئیں ان کے جذبۂ خودسپردگی کی بہترین مثال ہے۔ ۱

ان کرداروں کے مکالمے بھی انسان دوستی، خداپرستی، محبت رسول، قوت یقین، ذوق شہادت، شرافت نفس اور عجز وخاکساری کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ کہانی ''چودھویں رات کی دوشیزہ'' میں اسپین کا خداپرست نوجوان حکیم کی ہمت بندھاتے ہوئے اپنی قوت یقین کا اظہار یوں کرتا ہے:

''نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا: میرے غمگسار میزبان! میں تمہیں اندھے اعتقاد کی تاریکی سے باہر نکالنا چاہتا ہوں۔ میرے ہاتھوں میں یقین کی جو تلوار ہے، اس کی کاٹ سے تم ابھی واقف نہیں۔ اس تلوار سے چشم زدن میں بڑی سی بڑی باطل قوتوں کا سر میں نے قلم کر کے رکھ دیا ہے۔'' ۲

اور ذوق شہادت کی تبلیغ کرتے ہوئے عربی سوار، شام کے سرفروش نوجوانوں کا خیر مقدم اس طرح کرتے ہیں:

''خوش آمدید کہتے ہوئے عربی سوار گھوڑے سے اتر پڑے اور اسلامی تہذیب کے مطابق معانقہ اور مصافحہ سے فارغ ہو کر انہوں نے کہا کہ اذان کی آواز سن کر ہم بھی اس غرض سے نکلے تھے۔

آپ حضرات کی مجاہدانہ امنگوں سے ہمارے حوصلے بڑھ گئے، خدائے قدیر ہر مسلمان نوجوان کو اپنے دین کے لیے اسی طرح کی سرفروشی کا جذبہ عطا فرمائے۔ ایمان کی یہی تپش ملت اسلام کی نبض کو پرسوز اور متحرک رکھتی ہے، جس قوم میں آپ جیسے فلک پیما، ہمت رکھنے والے مجاہد ہوں، اس کا پرچم سرنگوں نہیں ہوسکتا۔'' ۳

۱۔ دیکھیے، کہانی، شادی کی پہلی رات

۲۔ کہانی، پاکدامن نوجوان

۳۔ نفس مصدر

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ علامہ نے ان کرداروں کے ذریعہ ایمان و یقین کی پختگی اور اصلاح معاشرہ کی کوشش کی ہے۔

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو، کہانی ''سوداگر کی بیٹی'' میں جب غزالہ کی آبرو پر بن آئی تو اس کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکل پڑا:

''یارسول اللہ اپنی فاطمہ کے صدقے میری آبرو بچایئے۔'' ۱

ابھی یہ چیخ ہوا میں پوری طرح تحلیل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اچانک سارے محل میں یہ شور برپا ہو گیا کہ بادشاہ کو ایک زہریلے بچھو نے ڈنک مار دیا ہے، اس طرح غزالہ کی آبرو لٹنے سے بچ گئی۔

غزالہ کو ایک بار پھر اسی طرح کے حالات سے دوچار ہونا پڑا، مگر اس بار بھی کسی غیبی قوت نے اس کی عزت پر آنچ نہیں آنے دی، چنانچہ اس کے دل میں غیبی چارہ گری کا جو یقین پیدا ہوا اس کی ترجمانی، وہ اس طرح کرتی ہے:

''آج میرے ایمان و یقین کے عروج کی کوئی انتہا نہیں تھی، میں نے دست رحمت کی توانائیوں کا بے حجاب تماشہ دیکھا تھا، یہ راز اچھی طرح سمجھ میں آ گیا تھا کہ انسان کسی آزمائش میں ثابت قدم رہے تو رحمت کارساز اسے تنہا نہیں چھوڑتی، خدا آباد رکھے طیبہ کی نورانی سرزمین کو، گیتی کے مظلوموں کی وہ بہترین پناہ گاہ ہے، کوئی کہیں بھی رہے، دل مغموم کا نالہ رائیگاں نہیں جاتا۔'' ۲

یہ اقتباس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غیب دانی اور قوت تصرف کا اظہار ہے۔ اس کوشش میں بعض کہانیوں کے مکالمے کہیں کہیں طویل بھی ہو گئے ہیں، باوجود اس کے وہ صورتحال کے عین مطابق ہیں۔ اپنے مکالموں کے ذریعہ انھوں نے ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ بعض جگہ وہ کرداروں کی گفتگو کا سلسلہ زیادہ دیر نہیں چلنے دیتے اور دو ایک جملوں کے بعد خود درمیان میں حائل ہو کر صورتحال کی ترجمانی کرنے لگتے ہیں۔ بعض

۱۔ کہانی، سوداگر کی بیٹی

۲۔ نفس مصدر

مکالموں سے ان کی علمیت بھی ظاہر ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کردار کی زبان نہیں، بلکہ خود قصہ نگار کی زبان ہے، ایک مثال دیکھئے:

''فرشتے نے جواب دیا:

پوچھنے کی وجہ حیرت ہے اور وہ محتاج بیان نہیں۔

تم ہی سوچو وہ محمد، نور مجرد سے جنکا عنصر تیار ہوا......اور کنز مخفی میں جن کی نشو ونما ہوئی......اور اب جس کے دم سے نورانیوں کا عالم آباد ہے......وہ دیار نور ہے، اس جہان تاریک میں کیوں کر آسکتے ہیں؟ آخر ہم کیسے باور کرلیں کہ وہ محمد کہ جن کے رخ کی روشنی میں ہم لوح محفوظ کے نوشتے پڑھ پاتے ہیں، وہ یہاں آگئے، کرۂ ارض جو کائنات کا سب سے نچلا طبقہ ہے اور وہ محمد جس کے قدم کے قریب عالم امکان کی بلندیاں ختم ہو جاتی ہیں، دونوں میں کیا جوڑ ہے؟ عالم نور کا پروردۂ ناز اس ظلمت کدۂ خراب میں......آخر کیسے یقین آسکتا ہے۔'' ۱

علامہ نے اپنے قصوں میں نفسیاتی مطالعے اور عمیق مشاہدے سے مدد لیکر فطرت انسانی کی بڑی اچھی ترجمانی کی ہے۔ صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں، حضرت مسلم کی شہادت کے بعد دشت غربت میں بھٹکتے ان کے دونوں بچے جس کیفیت اور صبر آزما حالات سے دوچار تھے، اس کی ترجمانی جس فنکاری و ہنرمندی سے علامہ نے کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہر لفظ حسرت و یاس، خوف و دہشت اور رنج و غم کی منہ بولتی تصویر ہے اور جسے پڑھنے کے بعد نہ دل پر قابو رہتا ہے اور نہ آنکھیں خود کو روک پاتی ہیں:

''ہائے رے گردش ایام! کل تک جن لاڈلوں کا قدم پھولوں کی سیج پر تھا، آج انہی کی راہوں میں کانٹوں کی برچھیاں کھڑی تھیں۔ جو اپنے نانا جان کے مزار تک بھی باپ کی انگلیوں کا سہارا لیے بغیر نہیں جاسکتے تھے، آج وہ یکہ و تنہا دشت غربت میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ کبھی عادت نہیں تھی، چلتے چلتے گر پڑتے، قدم قدم پر ٹھوکر لگتی، تلووں میں کانٹے چبھتے تو اف کر کے بیٹھ جاتے، ہوا سنسناتی تو دہشت سے کانپنے لگتے، پتے کھڑکتے تو ننھا سا کلیجہ سہم جاتا، درندوں کی آواز آتی تو چونک کر ایک دوسرے سے لپٹ جاتے، ڈر لگتا تو ٹھٹھک جاتے،

۱۔ کہانی، ایک وجود دو حیرتوں کا مجموعہ

پھر چلنے لگتے، کبھی بلک بلک کر ماں کو یاد کرتے، کبھی مچل مچل کر باپ کو آواز دیتے، کبھی حیرانی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ تکتے اور کبھی ڈبڈبائی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتے۔

جب تک پاؤں میں سکت رہی اسی کیفیت کے ساتھ چلتے رہے، جب مایوس ہو گئے تو ایک جگہ تھک کر بیٹھ گئے۔'' ۱

انہوں نے اپنے قصوں میں منظر نگاری کے بھی کامیاب نمونے پیش کیے ہیں۔ چاندنی رات کی دلفریبی، بارات کی آمد، شاہی کروفر اور میدان جنگ کی خوفناکی وغیرہ کے مناظر اس طرح پیش کیے گئے ہیں کہ سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے ابھر آتا ہے۔

مدینے کی ایک رات کا منظر ملاحظہ فرمائیے:

''چاندنی رات کا پچھلا پہر تھا......مدینے کی گلیوں میں ہر طرف نور برس رہا تھا اور پوری آبادی رحمتوں کی گود میں محوخواب تھی......آسمانوں کے دریچے کھل گئے تھے، فضائے بسیط میں فرشتوں کے پروں کی آواز دم بدم تیز ہوتی جا رہی تھی......عالم بالا کا یہ کارواں شاید مدینے کی زمین کا تقدس چومنے آ رہا تھا۔

اچانک اسی خاموش سناٹے میں بہت دور ایک آواز گونجی، فضاؤں کا سکوت ٹوٹ گیا، شبستان وجود کے سارے تار بکھر گئے اور ایمان کی تپش چنگاریوں کی طرح بال بال سے پھوٹنے لگی۔'' ۲

علامہ علیہ الرحمہ نے کرداروں کی پیکر تراشی میں بھی کمال ہنرمندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ لفظوں سے ایسی تصویر بناتے ہیں کہ سارا سراپا نظروں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔

اس حوالے سے یہ مثال دیکھئے:

''کمشنر کی ایک نوجوان لڑکی تھی، ہزاروں لالہ رخوں اور زہرہ جمالوں کی کہانیاں اس کی ایک ایک ادا میں سمٹ آئی تھیں، سرشار آنکھوں سے شراب کے پیمانے چھلکتے، مہتاب کی طرح درخشاں پیشانی ہر وقت موج نور میں غرق رہتی، چلتی تو فتنۂ محشر جگاتی، باتیں کرتی تو

۱۔ کہانی، دو یتیموں کا خون

۲۔ کہانی، پیکر وفا

پھول جھڑتے ، جمال و رعنائی اور حسن و دلکشی کا وہ ایک ایسا مجسمہ تھی کہ مغربی تہذیب کے گھرانے میں بھی ہر وقت وہ پردے میں رہتی تھی۔'' ۱

اور حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا یہ سراپا:

''سر سے پا تک مجسم سیاہی، خوفناک اندھیرا، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹے موٹے ہونٹ، چوڑے چکلے دانت، چپٹی ناک، بھدا چہرا اور تنگ و تاریک پیشانی، ہاتھ اور پاؤں بھی نہایت بونڈے، قد و قامت بھی بالکل بے ڈھنگا۔'' ۲

ان قصوں کی زبان بھی اتنی شگفتہ، تیریں، برجستہ، رواں دواں، سلیس اور پختہ ہے کہ قاری کا ذوق لطیف ایک نئی چاشنی اور لذت محسوس کرتا ہے۔ محاوروں کا برمحل استعمال، نازک تشبیہات واستعارات اور فصاحت و بلاغت کے جواہر ہر طرف موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ زبان کے اعجاز کا ایک نمونہ دیکھیے۔

کہانی ''انعام شکست'' میں حضرت جنید سید زادے سے مخاطب ہیں:

''کشور عقیدت کے تاجدار! میری عزت اور ناموس کا اس سے بہترین مصرف اور کیا ہوسکتا ہے کہ اسے تمہارے قدموں کی اڑتی ہوئی خاک پر نثار کردوں۔ چمنستان قدس کی پژمردہ کلیوں کی شادابی کے لیے اگر میرے جگر کا خون کام آسکے تو اس کا آخری قطرہ بھی تمہارے نقش پا میں جذب کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' ۳

اور تشبیہات سے پر ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ذرا دیکھیے! یہ کالی گھٹاؤں کی طرح کاکل، یہ چاند کی طرح درخشاں پیشانی، یہ نور کی موجوں میں نکھرا ہوا چہرا، یہ پروئے ہوئے موتیوں کی طرح دانتوں کی قطار، یہ پھولوں کی پنکھڑی کی طرح پتلے پتلے ہونٹ، یہ گلریز تبسم، یہ گہربار تکلم، یہ رحمتوں کا سویرا، سرگیں آنکھیں، یہ معصوم اداؤں کا چشمۂ سیال، سچ بتائیے کیا یتیموں کی یہی سج دھج ہوتی ہے۔'' ۴

۱۔ کہانی، جلوۂ زیبا

۲۔ کہانی، نصیبے کی ارجمندی

۳۔ کہانی، انعام شکست

۴۔ کہانی، دو شہزادے

بلاغت کا بھی ایک نمونہ دیکھیے:

''بچی کیا تھی، حسن وزیبائی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ایک مورت تھی، جو دیکھتا حیران وششدر رہ جاتا، سارے شہر میں بجلی کی طرح یہ خبر مشہور ہوگئی کہ سونار کے گھر میں آسمان کی زہرا اتر آئی ہے۔'' ۱

اور فصاحت زبان کی یہ مثال:

''مدینے کی مسافت گھٹتے گھٹتے اب چند منزل رہ گئی ہے، ابھی سے پہاڑوں کا جگر کانپ رہا ہے، زمین کی چھاتی دہل رہی ہے، قیامت کو پسینہ آرہا ہے کہ کربلا کے فریادی مالک کونین کے پاس جا رہے ہیں، قافلے میں حسین نہیں ہیں، ان کا کٹا ہوا سر چل رہا ہے، استغاثے کے ثبوت کے لیے کہیں سے گواہ لانا نہیں ہے، بغیر دھڑ کا حسین جب اپنے نانا جان کی تربت پر حاضر کیا جائے گا تو خاک دانہ گیتی کا انجام دیکھنے کے لیے کس کے ہوش سلامت رہ جائیں گے۔'' ۲

اب محاوروں کا برمحل استعمال دیکھیے:

''جنید نامی خلیفہ بغداد کا درباری پہلوان مملکت کی ناک کا بال تھا، وقت کے بڑے بڑے سورما اس کی طاقت اور فن کا لوہا مانتے تھے۔'' ۳

''بیٹے کی غلط روی اور ہلاکت خیز روش سے باپ کے تمام ارمانوں کا خون ہو گیا..... جگر کا خون سوکھنے لگا، رگوں کی آگ سرد پڑنے لگی۔'' ۴

''عالمگیر کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، آنکھوں سے چنگاری پھوٹ رہی تھی اور کوتوال کا خون سوکھتا جا رہا تھا۔'' ۵

''انھوں نے نہایت رازدارانہ لہجے میں مجھے شیشے میں اتارنے کی کوشش کی۔'' ۶

۱۔ کہانی، دل کا یقین

۲۔ کہانی، تاراج کارواں

۳۔ لالہ زار، ص:197

۴۔ نقش مصدر، ص:126

۵۔ نقش مصدر، ص:175

۶۔ ایضاً، ص:64

ان قصوں کی زبان میں کہیں کہیں شعریت بھی پائی جاتی ہے، مثلاً یہ اقتباس:

''معراج کی شب تھی......سارا عالم بالا سلطان کونین کے خیر مقدم کے لیے چشم براہ تھا......ملائکہ و مرسلین کے جھرمٹ میں شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ سرکار کی سواری پہنچی......سلامی کے لیے قدسیوں کے بیڑے جھک گئے......عرش کا پرچم سرنگوں ہو گیا.....امیدوں کے ہجوم سے گزرتے ہوئے عالم ملکوت کا معائنہ فرمایا.....اب گشت کے لئے باغ فردوس کی طرف بڑھے......مرحبا کہنے کے لیے ہر طرف حور و غلماں کی صفیں ایستادہ تھیں......حضرت جبریل امین قدم قدم پر ہمرکاب تھے۔'' ۱

علامہ نے کہیں کہیں شعری فضا کا بھی اہتمام کیا ہے، دو مثال پیش خدمت ہے:

''حضرت امام عالی مقام کا سر مبارک مادر مشفقہ حضرت سیدہ فاطمہ کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ دریا کا بچھڑا ہوا قطرہ دریا میں جا ملا، پھر اٹھتی ہوئی موجوں نے اسے آغوش میں لے لیا:

آمدہ بودیم از دریا بہ موج
باز از موجے بدریای رویم ۲

''دل اگر بے یقینی کے آزار میں مبتلا نہیں ہے تو دنیا کی کوئی طاقت بھی اسے شکست نہیں دے سکتی:

دل ہی ڈبوئے دل ہی ترائے
دل سا دوست نہ دل سا دشمن ۳

المختصر علامہ علیہ الرحمہ کی ہر کہانی اثر انگیز ہے۔ کہانی ختم کرنے کے بعد بعض مثبت خیالات و احساسات قاری کے ذہن میں اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ وحدت اثر پیدا کرنے کے

۱۔ کہانی، نصیبے کی ارجمندی
۲۔ کہانی، تاراج کارواں
۳۔ کہانی، دل کا یقین

لیے انھوں نے واقعات کی تفصیل اور پیچیدگی سے پرہیز کیا ہے۔ کہانیوں کے عنوانات بھی ایسے ہیں جن میں تمام اشارے مضمر نظر آتے ہیں، جس سے قصہ کے موضوع اور وحدت اثر کی وضاحت میں مدد ملتی ہے۔

انھوں نے اپنے زیادہ تر قصوں میں صرف ایک واقعہ بیان کیا ہے اور جن قصوں میں ایک سے زائد واقعات بیان کیے ہیں، ان میں بھی ایک کو مرکزیت حاصل ہے۔ دوسرے غیر اہم واقعات ایک دوسرے کے متوازی چل کر اسی ایک مرکز پر سمٹ آتے ہیں۔ ان قصوں کو انھوں نے اس طرح مربوط کیا ہے کہ اسے درمیان سے نہیں پڑھا جاسکتا ہے۔ یعنی انہیں قصوں کی پلاٹ سازی پر بھی کمال دسترس حاصل تھا۔

ڈاکٹر رضوان احمد لکھتے ہیں:

''علامہ کی بیان کردہ حکایتیں درمیان سے نہیں سنی جاسکتیں۔ اگر ان کو آپ نے ایک بار شروع کردیا تو ختم کیے بغیر سکون کا سانس نہیں لے سکتے، بلکہ انھیں پڑھتے ہوئے تو سانس لینا بھی ناگوار لگتا ہے، کیونکہ انھوں نے جو مرصع سازی کی ہے، وہاں سانس بھی آہستہ لینے کو جی چاہتا ہے۔'' ۱

اور سید محمد اشرف قادری ''بزبان حکایت'' کے قصوں کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

''23 حکایتوں میں سے کسی کو پڑھنا شروع کردیجئے، قاری ابتدا سے ہی گرفت میں آجاتا ہے۔ ایک برقی رو جاری ہوجاتی ہے، جیسے علامہ کے قلم نے قاری پر مسمریزم سا کردیا ہے اور پھر آخری سطر کے بعد ہی وہ سحر ٹوٹتا ہے۔'' ۲

ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی کا بھی خیال ہے کہ:

''علامہ ارشد القادری افسانے نہیں گڑھتے بلکہ حقیقی واقعات کو اپنے قلم کی سحر کاری سے افسانوی زبان و بیان میں اس طرح سامنے لاتے ہیں کہ حقیقت کا کوئی بھی گوشہ کسی طرح کی آلودگی کے بغیر اپنا وہ روپ دکھاتا ہے کہ نگاہیں جلوؤں کے ہجوم میں گم ہوکر سچائی

۱۔ سہ ماہی رفاقت پٹنہ، ص:63، جون تا اگست 2002ء

۲۔ بزبان حکایت، ص:10

کے ایک ایک تاباں و توانا زاویہ کی زیارت سے محظوظ ہوتی ہیں اور ایمان و عقائد کا جہان نور آباد ہو جاتا ہے۔" ۱

قابل ذکر ہے کہ علامہ نے جس زمانے میں قصہ گوئی کی، اس دور میں کئی اور ادبا نے بھی تاریخی کہانیاں لکھیں، لیکن ان ادبا کا مطمح نظر اصلاح ذوق نہیں تھا۔ مثلاً اسی زمانے میں نسیم حجازی اور مائل ملیح آبادی نے بھی تاریخی کہانیاں اور ناول لکھے، لیکن انہوں نے قاری کے ذوق کا زیادہ خیال رکھا اور اصلاحی پہلو کو نظر انداز کر دیا۔ بعد میں الیاس سیتا پوری اور عنایت اللہ التمش نے متعدد تاریخی کہانیاں لکھیں، مگر انہوں نے رومانی پہلو کو ہی زیادہ اجاگر کیا۔ اس طرح تاریخی کہانی نگار کی حیثیت سے علامہ منفرد و ممتاز مقام کے حامل ہیں۔

اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جس دور میں علامہ نے یہ مبنی بر حکایات کہانیاں لکھیں، اس وقت ادب میں تعفن کا طوفان برپا تھا، جس کے بارے میں مولانا حالی پہلے ہی کہہ چکے تھے:

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر

یہ اردو ادب کا اس وقت کا منظر نامہ ہے، جب ترقی پسند تحریک نے جنم نہیں لیا تھا۔ ترقی پسند تحریک نے تو ادب کو مزید پراگندہ کر دیا، کیونکہ پہلے تو ادب میں صرف گندگی، عریانی اور فحاشی تھی، مگر ترقی پسندی نے اس میں بے دینی اور خدا دشمنی کا بھی اضافہ کر دیا۔ انہوں نے انسانوں کو صرف جنسی و معاشی مطالبات کا غلام سمجھا اور اعلیٰ و ارفع روحانی و اخلاقی قدروں کا مضحکہ اڑایا۔ یقیناً اسے اعلیٰ درجے کا ادب نہیں کہا جا سکتا۔ ایسے میں دینی، ملی اور اصلاحی ادب کی بات کرنا صحرا میں اذان دینے جیسا تھا، مگر علامہ کا کمال ہے کہ انہوں نے ایسے پراگندہ اور خدا بیزار ماحول میں بھی ذہنوں کی تطہیر کا سامان فراہم کیا اور ایک پوری نسل کی ذہنی تعمیر و تربیت کا فریضہ انجام دیا، جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

۱۔ جام نور دہلی کا رئیس القلم نمبر، ص:96

دو یتیموں کا خون

آج خانوادۂ نبوت کے چشم و چراغ حضرت امام مسلم رضی اللہ عنہ کے مقدس خون سے کوفے کی سرزمین سرخ ہوگئی تھی۔ نبی زادے کے خیر مقدم کے لیے آنکھوں کا فرش بچھانے والی آبادی، اب اس کی تڑپتی ہوئی لاش کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

تلواروں کی دھار، برچھیوں کی انی اور تیروں کی نوک پر اب بھی خون کے نشانات موجود تھے۔ ابن زیاد کے حکم سے حضرت امام کی مقدس نعش شاہراہ عام پر لٹکا دی گئی تھی، جو کئی دن تک لٹکتی رہی۔ نبی کا کلمہ پڑھنے والے کھلی آنکھوں سے یہ ہولناک منظر دیکھتے رہے۔ آل رسول کی جان لے کر بھی شقاوتوں کی پیاس نہیں بجھ سکی۔

ہائے رے نیرنگیٔ عالم! زمین و آسمان کی وسیع کائنات جس کے گھر کی ملکیت تھی، آج اس کی تربت کے لیے کوفے میں گز بھر زمین نہیں مل رہی تھی۔ جس کی رحمتوں کے فیضان نے اہل ایمان کی جانوں کا نرخ اونچا کر دیا تھا، آج اُسی کے نور نظر کا خون ارزاں ہوگیا تھا۔ شرم سے سورج نے منہ چھپالیا، فضاؤں نے سوگ کی چادر اوڑھ لی اور جب شام آئی تو کوفہ ایک بھیانک تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ مہمان کے ساتھ دغا، کوفہ والوں کے حق میں قیامت تک کے لیے ضرب المثل بن گئی۔

شقاوتوں کی انتہا ابھی نہیں ہوئی تھی، بلکہ جور وستم کی وادی میں بدبختیوں کا گھنا اندھیرا اور بڑھتا جارہا تھا۔

اچانک رات کے سناٹے میں ابن زیاد کی حکومت کے ایک منادی نے اعلان کیا:

'' امام مسلم رضی اللہ عنہ کے دونوں بچے، جو ان کے ہمراہ آئے تھے، کہیں روپوش ہو گئے ہیں۔ حکومت کی طرف سے ہر خاص و عام کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ جو بھی انہیں اپنے گھر میں پناہ دے گا، اسے عبرت ناک سزا دی جائے گی اور جو انہیں گرفتار کر کے لائے گا، اسے انعام واکرام سے مالا مال کر دیا جائے گا۔ ''

حضرت امام مسلم رضی اللہ عنہ کے دونوں بچے، جن میں سے ایک کا نام محمد تھا اور ان کی عمر آٹھ سال کی تھی اور دوسرے کا نام ابراہیم تھا اور ان کی عمر چھ سال کی تھی، کوفے کے مشہور عاشق رسول قاضی شریح کے گھر میں پناہ گزیں تھے۔ یہ اعلان سن کر قاضی شریح کا کلیجہ ہل گیا۔ حضرت امام مسلم رضی اللہ عنہ کے جگر گوشوں کا دردناک انجام نگاہوں کے سامنے ناچنے لگا۔ دیر تک اسی فکر میں غلطاں رہے کہ کس طرح انہیں ظالموں کے چنگل سے بچایا جائے۔

کافی غور وخوض کے بعد یہ صورت سمجھ میں آئی کہ راتوں رات بچوں کو کوفے سے باہر منتقل کر دیا جائے۔ اضطراب کی حالت میں اپنے بیٹے کو آواز دی:

''نہایت احتیاط کے ساتھ کسی محفوظ راستے سے بچوں کو شہر پناہ کے باہر پہنچادو۔ رات کو مدینے کی طرف جانے والا ایک قافلہ آبادی کے قریب سے گزر رہا ہے، انہیں کسی طرح ان کے ساتھ لگادو۔ ''

زادراہ مکمل ہو جانے کے بعد رخصت کرنے کے لیے دونوں بچوں کو سامنے بلایا۔ جوں ہی ان پر نظر پڑی فرط غم سے آنکھیں بھیگ گئیں....ضبط کا پیمانہ چھلک اُٹھا.... منہ سے ایک چیخ نکلی اور بے تاب ہو کر دونوں بچوں کو سینے سے لگالیا.... پیشانی چومی، سر پر ہاتھ رکھا اور سکتے کی حالت میں دیر تک دم بخود رہے۔

باپ کی شہادت کے واقعہ سے بچے اب تک بے خبر رکھے گئے تھے، اور نہ انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ اب خود ان کی ننھی گردنیں بھی خون آشام تلواروں کی زد پہ ہیں۔

قاضی شریح کی اس کیفیت پر بچے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ بڑے بھائی نے حیرانی کے عالم میں دریافت کیا:

''ہمیں دیکھ کر گریۂ بے اختیار کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ اچانک اتنی رات کو پاس بلا کر ہمارے سروں پہ شفقت کا ہاتھ رکھنا، بے سبب نہیں ہے۔ اس طرح کی پھوٹ پڑنے والی ہمدردی تو ہمارے خاندان میں یتیموں کے ساتھ کی جاتی ہے۔''

تیز نشتر کی طرح دل میں آر پار ہو جانے والا یہ جملہ ابھی ختم نہیں ہو پایا تھا کہ پھر فضا میں ایک چیخ بلند ہوئی اور قاضی شریح نے برستی ہوئی آنکھوں کے ساتھ گلوگیر آواز میں بچوں کو جواب دیا:

'' گلشن رسول کے مہکتے غنچو! کلیجہ منہ کو آرہا ہے، زبان میں تاب گویائی نہیں ہے۔ کس طرح خبر دوں کہ تمہارے ناز کا چمن اُجڑ گیا اور تمہاری امیدوں کا آشیانہ دن دہاڑے ظالموں نے لوٹ لیا ہے۔ ہائے! تم پردیس میں یتیم ہو گئے۔ تمہارے باپ کو کوفیوں نے شہید کر ڈالا اور اب تمہاری ننھی جان بھی خطرے میں ہے۔ آج شام ہی سے خون کے پیاسے تمہاری تلاش میں ہیں۔ ننگی تلواریں لیے ہوئے حکومت کے جاسوس تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں۔''

یہ خبر سن کر دونوں بچے ہیبت وخوف سے کانپنے لگے۔ ننھا سا کلیجہ سہم گیا۔ پھولوں کی شاداب پنکھڑی مرجھا گئی۔ منہ سے ایک چیخ نکلی اور غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔ ہائے رے تقدیر کا تماشا! ابھی چند ہی دن ہوئے کہ ماں کی ممتا نے پیار کی ٹھنڈی چھاؤں میں مدینے سے رخصت کیا تھا۔ ناز اٹھانے کے لیے باپ کی شفقتوں کا قافلہ ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اب نہ باپ کا دامن ہے کہ پکڑ کر مچل جائیں، نہ ماں کا آنچل ہے کہ سہم جائیں تو منہ چھپالیں۔ کچی نیند سو کر اٹھنے والے اب کسے آواز دیں؟.....کون ان کی پلکوں کا آنسو اپنی آستین میں جذب کرے؟

آہ! غنچوں کی وہ نازک پنکھڑی جو شبنم کا بار بھی نہیں اُٹھا سکتی، آج اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔

پردیس میں ننھی جانوں کے لیے باپ کی شہادت ہی کی خبر کیا کم قیامت تھی کہ اب خود اپنی جان کے بھی لالے پڑ گئے تھے۔ قضا تیغ برہنہ لیے سر پہ کھڑی تھی۔ آنکھوں کے سامنے امیدوں کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ قاضی شریح سے بچوں کا بلک بلک کر رونا اور پچھاڑیں کھا کھا کر تڑپنا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا:

''بنو ہاشم کے نونہالو! اس طرح پھوٹ پھوٹ کر مت رؤو۔ دشمن دیوار سے کان لگائے کھڑے ہیں۔ تم اپنے باپ کی ایک مظلوم یادگار ہو۔ تاجدار عرب کی ایک مقدس امانت ہو۔ نازک آبگینوں کو کہیں ٹھیس لگ گئی تو میں عرصۂ محشر میں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گا۔ اس لیے میری کوشش ہے کہ تمہیں کسی طرح مدینے کے دارالامان تک پہنچا دیا جائے۔''

اسی وقت رات کے سناٹے میں تم دونوں ہمارے بیٹے کے ہمراہ کوفے سے باہر نکل جاؤ اور جو قافلہ مدینے کی طرف جا رہا ہے، اس میں شامل ہو جاؤ۔ اپنے نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار رحمت میں پہنچ کر ہماری طرف سے درود وسلام کی نذر پیش کر دینا۔ اچھا جاؤ، خدا تمہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے۔''

بھیگی پلکوں کے سائے میں قاضی شریح نے بچوں کو رخصت کیا۔ پاسبانوں اور جاسوسوں کی نگاہوں سے چھپ چھپا کر قاضی شریح کے بیٹے نے بحفاظت تمام انہیں کوفہ کے شہر پناہ کے باہر پہنچا دیا۔ سامنے کچھ ہی فاصلے پر ایک گزرتے ہوئے قافلے کی گرد نظر آئی۔ اُنگلی کے اشارے سے بچوں کو دکھلایا۔ اشارا پاتے ہی تیزی سے بچے قافلے کی طرف دوڑے اور نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

رات کا وقت، دہشت خیز سناٹا، بھیانک اندھیرا، خوف و ہیبت میں ڈوبا ہوا ماحول اور آغوش مادر کی تازہ بچھڑی ہوئی دو ننھی جانیں۔ نہ ہاتھ میں عقل وشعور کا چراغ، نہ ساتھ میں کوئی رفیق ورہبر، تھوڑی دور چل کر راستہ بھول گئے۔ ہائے رے گردش ایام! کل تک جن لاڈلوں کا قدم پھولوں کی سیج پر تھا، آج ان ہی کی راہ میں کانٹوں کی برچھیاں کھڑی تھیں۔ جو اپنے نانا جان کے مزار تک بھی باپ کی انگلیوں کا سہارا لیے بغیر نہیں جا سکتے تھے، وہ آج یکہ وتنہا دشت غربت میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ کبھی سفر کی عادت نہیں تھی۔ چلتے

چلتے گر پڑتے۔ قدم قدم پر ٹھوکر لگتی۔ تلوؤں میں کانٹے چبھتے تو اُف کر کے بیٹھ جاتے۔ ہوا سنسناتی تو دہشت سے کانپنے لگتے۔ پتے کھڑکتے تو ننھا سا کلیجہ سہم جاتا۔ درندوں کی آواز آتی تو چونک کر ایک دوسرے سے لپٹ جاتے۔ ڈر لگتا تو ٹھٹھک جاتے۔ پھر چلنے لگتے۔ کبھی بلک بلک کر ماں کو یاد کرتے، کبھی مچل مچل کر باپ کو آواز دیتے، کبھی حیرانی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ تکتے اور کبھی ڈبڈباتی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتے۔

جب تک پاؤں میں سکت رہی، اسی کیفیت کے ساتھ چلتے رہے۔ جب مایوس ہوگئے تو ایک جگہ تھک کر بیٹھ گئے۔

ذرا تقدیر کا تماشہ دیکھیے کہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ڈھلتی ہوئی چاندنی ہر طرف بکھر گئی تھی۔ ابن زیاد کی پولیس کا ایک دستہ جوان بچوں کی تلاش میں نکلا تھا۔ گشت کرتا ہوا ٹھیک وہیں پر آ کر رُکا۔ جوں ہی بچوں پر نظر پڑی قریب آیا اور دریافت کیا: ''تم کون ہو؟''

بچوں نے یہ سمجھ کر کہ یتیموں کے ساتھ ہر شخص کو ہمدردی ہوتی ہے، اپنا سارا حال صاف صاف بیان کر دیا۔

ہائے رے بچپن کی معصومیت! ان بھولے بھالے نونہالوں کو کیا خبر تھی کہ وہ خون کے پیاسوں کو اپنا پتہ بتا رہے ہیں؟

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ یہی حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کے دونوں بچے ہیں، جلادوں نے انہیں گرفتار کر لیا۔ مشکیں کسیں اور گھسیٹتے ہوئے اپنے ہمراہ لے چلے۔

یہ دردناک منظر دیکھ کر ڈوبتے ہوئے تاروں کی آنکھیں جھپک گئیں۔ چاند کا چہرا فق ہو گیا۔ شدت کرب سے ابن عقیل رضی اللہ عنہ کے یتیم بچے بلبلا اُٹھے اور دل ہلا دینے والی ایک فریاد صحرا میں گونجی:

''ہم بن باپ کے بچے ہیں۔ ہماری یتیمی پر رحم کرو۔ رات بھر چلتے چلتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ ہماری مشکیں کھول دو۔ اب اذیت برداشت کرنے کی سکت باقی نہیں ہے۔ نانا جان کا واسطہ، ہمارے گھائل جسم پر ترس کھاؤ۔ سنسان جنگل میں یتیموں کی فریاد سن لو۔''

اس نالۂ درد سے دھرتی کا کلیجہ ہل گیا، لیکن سنگدل اشقیاء ذرا بھی متاثر نہیں

ہوئے۔ ترس کھانے کے بجائے ظالموں نے فرط غضب میں پھول جیسے رخساروں پر طمانچہ مارتے ہوئے سخت لب و لہجے میں جواب دیا:

''تمہاری تلاش میں کئی دن سے آنکھوں کی نیند اڑ گئی ہے۔ کھانا پینا حرام ہو گیا ہے اور تم راہ فرار اختیار کرنے کے لیے جنگل جنگل چھپتے پھر رہے ہو...... جب تک تم کیفر کردار کو نہیں پہنچ جاتے، تم پر کوئی رحم نہیں کیا جائے گا۔''

طمانچوں کی ضرب سے نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی صورتیں ماند پڑ گئیں۔ چہرے پر انگلیوں کے نشانات اُبھر آئے۔ رونے کی بھی اجازت نہیں تھی کہ دل کا بوجھ ہلکا ہوتا۔ ایک گرفتار پنچھی کی طرح سسکتے، لرزتے، کانپتے، سر جھکائے، شکنجے میں کسے قدم قدم پر جفا کاروں کے ظلم و ستم کی چوٹ کھاتے رہے۔

اُمید کا چراغ گل ہو چکا تھا۔ دل کی آس ٹوٹ چکی تھی۔ سب کو آواز دے کر تھک چکے تھے۔ کہیں سے کوئی چارہ گر نہیں آیا۔ بالآخر ننھا سا دل مایوسیوں کے ساتھ اتھاہ ساگر میں ڈوب گیا۔

اب موت کا بھیانک سایہ دن کے اجالے میں نظر آ رہا تھا۔ اسی عالم یاس میں وہ کشاں کشاں کوفہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اپنے مستقر پر پہنچ کر سپاہیوں نے ابن زیاد کو خبر دی۔

حکم ہوا کہ بچوں کو قید خانے میں ڈال دیا جائے اور جب تک دمشق سے کوئی اطلاع نہیں آ جاتی، ان پر کڑی نگرانی رکھی جائے۔

حکومت کے سپاہی ابن زیاد کی ہدایت کے مطابق دونوں بچوں کو داروغۂ جیل کے حوالہ کر کے چلے گئے۔ داروغہ نہایت شریف النفس اور جاں نثار اہل بیت تھا۔ اس نے نہایت عقیدت و محبت کے ساتھ ہاشمی شہزادوں کی راحت و آسائش کا اہتمام کیا۔

رات کا دوسرا پہر شروع ہوتے ہی، اس نے اپنی جان پر کھیل کر دونوں بچوں کو جیل سے باہر نکالا اور اپنی حفاظت میں قادسیہ جانے والی سڑک پر انہیں پہنچا کر ایک انگوٹھی دی اور اپنے بھائی کا پتہ بتاتے ہوئے کہا:

"قادسیہ پہنچ کر تم اس سے ملاقات کرنا اور بطور نشانی یہ انگوٹھی دکھانا، وہ بحفاظت تمام تمہیں مدینہ پہنچا دے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے بچوں کو رخصت کیا۔

قادسیہ کی طرف جانے والا کارواں کچھ ہی دور تیار کھڑا تھا۔ بچے بے تحاشہ اس کی طرف دوڑے، لیکن نوشتۂ تقدیر نے پھر یہاں اپنا کرشمہ دکھایا، پھر گھٹا کی اوٹ سے نکلا ہوا سورج گہنا گیا، پھر مدینے کے ان ننھے مسافروں کو دشت غربت کی بلاؤں نے آ کے گھیر لیا، پھر کچھ دور چل کر راستہ بھٹک گئے اور قافلہ نظر سے اوجھل ہو گیا۔

پھر رات کا وہی بھیانک سناٹا، وہی خوف ناک تاریکی، وہی سنسان جنگل، وہی شام غربت کا ڈراؤنا خواب، ہر طرف خون آشام تلواروں کا پہرہ، قدم قدم پر دہشتوں کا سایہ۔

چلتے چلتے پاؤں شل ہو گئے۔ تلوؤں کے آبلے پھوٹ پھوٹ کر بہنے لگے۔ روتے روتے آنکھوں کا چشمہ سوکھ گیا۔ صبح ہوئی تو یہ دیکھ کر حیرت واستعجاب کی انتہا نہ رہی کہ جہاں سے رات کو چلے تھے، گھوم پھیر کر وہیں آ پہنچے ہیں۔

ہائے رے تقدیر کا چکر! اس دنیا میں کیڑے مکوڑوں اور چرند و پرند تک کا اپنا رین بسیرا ہے، لیکن خاندان نبوت کے دو ننھے یتیموں کے لیے کہیں پناہ کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

جب سویرا ہو گیا اور ہر طرف لوگوں کی آمد ورفت شروع ہو گئی، تو کل کی گرفتاری کا واقعہ یاد کر کے بچے بے قرار ہو گئے۔ دشمن کی نظر سے چھپنے کے لیے ہر طرف نظر دوڑائی، لیکن چٹیل میدان میں کوئی محفوظ جگہ نہیں مل سکی۔ حیرانی، بیچارگی، مایوسی اور خوف وہراس کے عالم میں دونوں بھائی حسرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

ننھا سا دل، کم سنی کی عقل..... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائیں؟...کیا کریں؟ انجام سوچ کر آنکھیں ڈبڈبا آئیں...... تھوڑی ہی دور ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔ بڑے بھائی نے چھوٹے سے کہا:

"چلو وہاں ہاتھ منہ دھولیں۔ نماز فجر کا وقت بھی ہو گیا ہے۔ خدا کی طرف سے اگر ہمارا آخری وقت آ ہی گیا ہے تو اب اسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔"

چشمے کے قریب پہنچ کر انہیں ایک بہت پرانا درخت نظر آیا۔ اس کا تنا اندر سے کھوکھلا تھا۔ پناہ کی جگہ سمجھ کر دونوں بھائی اسی میں چھپ کر بیٹھ گئے۔

ذرا سی آہٹ ہوتی تو دل دھڑ کنے لگتا۔ کوئی راہ گیر گزرتا تو دشمن سمجھ کر سہم جاتے۔ ایک پہر دن چڑھنے کے بعد کوفہ کی طرف سے ایک لونڈی پانی بھرنے کی غرض سے چشمے کے کنارے آئی۔ پانی میں برتن ڈبونا چاہتی تھی کہ اسے سطح آب پر آدمی کا عکس نظر آیا۔ پلٹ کر دیکھا تو دو ننھے بچے درخت کی کھوہ میں سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔

سفید پیشانی سے نور کی کرن پھوٹ رہی تھی اور لالہ کی طرح دہکتے ہوئے عارض پر موسم خزاں کی اُداسی چھا گئی تھی۔

لونڈی نے حیرانی کے عالم میں دریافت کیا:

"اے گلشن دلربائی کے نوشگفتہ پھولو! تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟"

ایک بار کے ڈرے ہوئے تھے، کچھ جواب دینے کے بجائے خوف و دہشت سے لرزنے لگے۔ پھوٹ پھوٹ کر بہنے والے آنسوؤں سے چہرہ شرابور ہو گیا۔

لونڈی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا:

"ناز کے پلے ہوئے لاڈلو! کسی طرح کا اندیشہ نہ کرو۔ دل سے دہشت نکال دو۔ یقین کرو، میں تمہارے گھر کی بھکارن ہوں، دشمن نہیں ہوں۔ تم نہ بھی اپنا پتہ ٹھکانہ بتاؤ، جب بھی تمہارا یہ نورانی چہرہ یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ تم بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی جنت کے پھول ہو۔"

"سچ سچ بتاؤ، کیا تم ہی دونوں امام مسلم رضی اللہ عنہ کے نونہال ہو؟"

لونڈی چہرے کی بلائیں لیتے ہوئے قریب آئی اور بولی:

"فلک نشیں شہزادو! کیڑے مکوڑوں کے بھٹ سے باہر نکلو..... آؤ! میرے دل میں بیٹھو..... میری آنکھوں میں سما جاؤ۔"

لونڈی کے اصرار پر بچے درخت کی کھوہ سے باہر نکلے اور ہمدرد و غمگسار سمجھ کر اس سے اپنا سارا حال بیان کر دیا۔

ان کی دردناک سرگزشت سن کر لونڈی کا کلیجہ ہل گیا۔ آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برسنے لگیں۔ دل کی بیقرار کیفیت پر قابو پانے کے بعد وہ بچوں کو چشمے کے کنارے لے گئی، اپنے ہاتھوں سے آنسو پونچھے، منہ دھلایا، بالوں کا غبار صاف کیا اور انہیں دلاسا دیتے ہوئے محفوظ راستے سے اپنے گھر لے آئی۔

اس کی مالکہ بھی خاندان اہل بیت سے والہانہ عقیدت رکھتی تھی۔ اس لیے اس نے اپنی مالکہ کے سامنے دونوں بچوں کو پیش کرتے ہوئے کہا:

''خوش نصیب بی بی! چمنستانِ فاطمی کے دو پھول لے کر آئی ہوں۔ یہ دونوں امام مسلم رضی اللہ عنہ کے لاڈلے ہیں۔ بن باپ کے یتیم بچے ہیں۔ پردیس میں ان کا کوئی نہیں ہے۔ ان کی بے کسی اور یتیمی پر ترس کھانے کی بجائے، ظالم اب ان بے گناہوں کے خون کے درپے ہیں۔ خوف و دہشت سے ننھا سا کلیجہ سوکھ گیا ہے۔ ہاشمی گھرانے کے یہ دونوں لعل ڈر کے مارے درخت کی ایک کھوہ میں چھپے ہوئے تھے۔ سورج سوا نیزے پہ آ گیا ہے، لیکن گہوارۂ مادر سے نکلے ہوئے ان شیر خوار بچوں کے منہ میں ایک نوالہ بھی اب تک نہیں پڑا ہے۔''

مالکہ یہ سارا ماجرہ سن کر تڑپ گئی۔ گریۂ بے اختیار سے اس کے آنچل کا دامن بھیگ گیا۔ وارفتگیٔ شوق میں بچوں کو گود میں بٹھالیا، چہرے کی بلائیں لیں، سر پر ہاتھ پھیرا اور نہلا دھلا کر کپڑے بدلوائے، آنکھوں میں سرمہ لگایا، زلفیں سنواریں اور کھلا پلا کر ایک محفوظ کوٹھری میں آرام کرنے کے لیے بستر لگا دیا۔

قدم قدم پر شفقت و پیار کا پھوٹتا ہوا سیلاب دیکھ کر غریب الوطن بچوں کو ماں یاد آ گئی۔ یکا یک ممتا کی گود کا دبا ہوا ارمان مچل اٹھا اور بے تاب ہو کر رونے لگے۔

پھول جیسے رخساروں پر ڈھلکتے ہوئے آنسو دیکھ کر مالکہ بے چین ہو گئی۔ دوڑ کر سینے سے لپٹا لیا۔ اپنے آنچل کے پلو سے آنسو پونچھے اور تسلی دیتے ہوئے کہا:

''میری آنکھوں کے تارو! اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو۔ تمہارے قدموں پر میری جان نثار، میری روح صدقے...... میں جب تک زندہ رہوں گی، تمہارا ہر ناز اٹھاؤں گی۔

تمہارے دم قدم سے میرے ارمانوں کا چمن کھل گیا ہے۔ میرے آنگن میں چھما چھم نور کی بارش ہورہی ہے۔''

رات کی بھیانک سیاہی ہر طرف پھیل گئی تھی۔ امام مسلم رضی اللہ عنہ کے یتیم بچوں کی تلاش میں حکومت کے جاسوس اور دنیا کے لالچی کتے گلی گلی پھر رہے تھے۔

ادھر کافی دیر تک گھر کی مالکہ اپنے شوہر ''حارث'' کے انتظار میں جاگتی رہی۔ ایک پہر رات ڈھل جانے کے بعد، وہ ہانپتا کانپتا، تھکا ماندہ گھر واپس لوٹا۔

بیوی نے یہ حال دیکھ کر اچنبھے سے پوچھا:

''آج اتنے پریشان اور بے حال کیوں نظر آتے ہیں آپ؟''

کچھ دم لینے کے بعد اس نے جواب دیا:

''تمہیں شاید خبر نہیں ہے کہ باغی مسلم کے ہمراہ اس کے دو بچے بھی آئے تھے۔ کئی دن تک وہ کوفہ میں روپوش رہے۔ پرسوں صبح کو مدینے کی طرف جانے والے راستے کے قریب انہیں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ کل رات کے کسی حصے میں داروغۂ جیل کی سازش سے وہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ ابن زیاد کی طرف سے عام منادی کردی گئی ہے کہ جو انہیں پکڑ کر لائے گا، اسے منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ وقت کا سب سے بڑا اعزاز حاصل کرنے کے لیے اس سے زیادہ زریں موقع اب ہاتھ نہیں آئے گا بیگم؟''

''صبح سے انہیں بچوں کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ دوڑتے دوڑتے برا حال ہوگیا ہے۔ ابھی تک کوئی سراغ نہیں لگ رہا ہے۔''

حارث کی بات سن کر بیوی کا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ دل ہی دل میں پیچ وتاب کھانے لگی۔ مسحور کر لینے والی ایک ادائے دلبرانہ کے ساتھ اس نے اپنے شوہر کو سمجھانا شروع کیا:

''ابن زیاد آل رسول کا خون ناحق بہا کر اپنی عاقبت برباد کر رہا ہے۔ دنیا کی آسائش چند روزہ ہے۔ انعام کی لالچ میں جہنم کا ہولناک عذاب مت خریدیئے!''

''ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر غور کیجیے کہ کل میدان حشر میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم کیا منہ دکھائیں گے؟''

حارث کا دل پوری طرح سیاہ ہو چکا تھا۔ بیوی کی باتوں کا کوئی اثر اس کے دل پر نہیں ہوا۔ اس نے جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا:

''مجھے نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عاقبت کا نفع نقصان میں خود بہتر سمجھتا ہوں۔ میرا ارادہ اٹل ہے۔ اسے اپنی جگہ سے کوئی بھی نہیں ہٹا سکتا۔''

سنگدل شوہر کی نیت بد معلوم ہونے کے بعد منٹ منٹ پر دل دھڑک رہا تھا کہ مبادا ظالم کو کہیں بچوں کی بھنک نہ لگ جائے۔ اس لیے جلد ہی اسے کھلا پلا کر سلا دیا اور جب تک نیند نہیں آ گئی، بالیں پر بیٹھی اسے باتوں میں بہلاتی رہی۔ جب وہ سو گیا، تو دبے پاؤں اٹھی اور بچوں کی کوٹھری میں تالا ڈال دیا۔

فکر سے آنکھوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ رہ رہ کر دل میں ہوک اُٹھتی تھی۔

ہائے اللہ! حرم نبوت کے ان راج دلاروں کو کچھ ہو گیا، تو حشر کے دن سیدہ زہرہ کو میں کیا منہ دکھاؤں گی؟

دنیا قیامت تک میرے منہ پر تھوکے گی کہ میں نے نبی زادوں کے ساتھ دغا کی۔ انہیں جھوٹا دم دلاسا دے کر مقتل کی راہ گزر تک لے آئی۔

آہ، میرے عشق پارسا کا سارا بھرم لٹ گیا۔ میرے حسین خوابوں کا تار تار بکھر گیا۔

ہائے افسوس! اس گھر کو معصوم بچے اپنا ہی گھر سمجھ رہے ہوں گے۔ کہیں یہ راز فاش ہو گیا تو ان کے ننھے دل پر کیا گزرے گی؟ وہ میرے بارے میں کیا خیال کریں گے، لیکن میرے دل کا حال تو خدا اور اس کے رسول سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ کچھ بھی ہو، جیتے جی لاڈلوں کی جان پر کوئی آفت نہیں آنے دوں گی۔

•

یا اللہ! مجھے اپنے محبوبوں کے عشق میں ثابت قدم رکھ..... ان کے آنسوؤں کا گوہر ٹپکنے سے پہلے میرے جگر کا خون ارزاں کر دے۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ کوفے کی بدنصیب آبادی پر ہر طرف نیند کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حارث بھی اپنے گھر میں بے خبر سو رہا تھا۔ دونوں بچے بند کوٹھری میں محو خواب ناز تھے

کہ اسی درمیان انہوں نے ایک نہایت دردناک اور ہیجان انگیز خواب دیکھا۔

چشمۂ کوثر کی سفید موجوں سے نور کی کرن پھوٹ رہی ہے۔ باغ فردوس کی شاہراہوں پر چاندنی کا غلاف بچھا دیا گیا ہے۔ قریب ہی کچھ فاصلے پر شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم، مولائے کائنات حضرت حیدر، بنت رسول حضرت فاطمہ زہرہ اور شہید مظلوم حضرت امام مسلم رضی اللہ عنہم اجمعین جلوہ فرما ہیں۔

دونوں بچوں پر نظر پڑتے ہی سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے امام مسلم سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''مسلم! تم خود تو آ گئے اور جور و ستم کا نشانہ بننے کے لیے ہمارے جگر پاروں کو اشقیاء کے ہاتھوں میں چھوڑ آئے۔''

حضرت مسلم نے نیچی نگاہ کیے جواب دیا:

''سیدی! وہ بھی پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ بہت قریب آ چکے ہیں۔ بس دو چار قدم کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ خدا نے چاہا تو کل کا سورج طلوع ہوتے ہی، وہ دامن رحمت کی ٹھنڈی چھاؤں میں مچل رہے ہونگے۔''

یہ خواب دیکھ کر دونوں بھائی چونک پڑے۔ بڑے نے چھوٹے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا:

''اب سونے کا وقت نہیں ہے۔ ہماری شب زندگی کی سحر ہو گئی۔''

''بھیا! اُٹھو.... بابا جان نے خبر دی ہے کہ اب ہم چند گھنٹوں کے مہمان ہیں۔ حوض کوثر پر نانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے انتظار میں کھڑے ہیں۔ دادی اماں نہایت بے تابی کے ساتھ ہماری راہ دیکھ رہی ہیں۔''

''بھیا، صبر کرلو.... اب دشمنوں کی خوں آشام تلواروں کی زد سے بچ نکلنا بہت مشکل ہے..... اب مدینے لوٹ کر جانا، نصیب نہیں ہوگا۔''

''ہائے امی جان! اب آخری وقت بھی ملاقات نہ ہو سکے گی۔''

چھوٹے بھائی نے ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ جواب دیا:

''بھائی جان، میں نے بھی اسی طرح کا خواب دیکھا ہے۔ کیا سچ مچ ہم لوگ کل صبح کو قتل کر دیئے جائیں گے؟''

''ہائے!......ایک دوسرے کو ذبح ہوتے ہم کیسے دیکھ سکیں گے بھیا؟''

یہ کہہ کر دونوں بھائی ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر لپٹ گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

قضا بھی تاک ہی میں تھی۔ نالۂ بے اختیار کی آواز سے جلاد حارث کی آنکھ کھل گئی۔ اور سوتی ہوئی قیامت جاگ اُٹھی۔

ظالم نے بیوی کو جگا کر پوچھا:

''یہ بچوں کے رونے کی آواز کہاں سے آرہی ہے؟''

صورت حال کی نزاکت سے بیوی کا کلیجہ سوکھ گیا۔ اس نے ٹالتے ہوئے جواب دیا:

''سو جایئے! کہیں پڑوس کے بچے رو رہے ہوں گے۔''

سنگدل نے تیور بدل کر کہا:

''پڑوس سے نہیں، ہمارے گھر سے یہ آواز آرہی ہے۔ ہو نہ ہو، یہ وہی مسلم کے بچے ہیں، جن کی تلاش میں کئی دن سے میں سرگرداں ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے اٹھا اور اس کوٹھری کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔ تالا توڑ کر دروازہ کھولا۔ اندر جا کر دیکھا تو دونوں بچے روتے روتے بے حال ہو گئے تھے۔

انتہائی کرخت لہجے میں دریافت کیا:

''تم کون ہو؟''

اچانک اس اجنبی آواز پر بچے سہم گئے، لیکن چونکہ اس گھر کو وہ اپنا دارالامان سمجھے ہوئے تھے، اس لیے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی تامل نہ ہوا کہ ہم امام مسلم کے یتیم بچے ہیں۔

یہ سن کر ظالم غصے سے دیوانہ ہو گیا:

''میں تو چاروں طرف ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہو رہا ہوں اور آپ لوگوں نے ہمارے ہی گھر میں عیش کا بستر لگا لیا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا اور نہایت بے رحمی کے ساتھ ان ننھے یتیموں کے رخساروں پر طمانچے برسانا شروع کر دیے۔ شدت کرب سے دونوں بھائی بلبلا اُٹھے۔ بے تحاشہ بیوی دوڑی اور یہ کہتے ہوئے درمیان میں حائل ہوگئی:

"ارے ظالم!......یہ کیا کر رہا ہے؟......ارے فاطمہ کے راج دلارے ہیں یہ.....ان کی چاند جیسی صورتوں پر ترس کھاؤ....ہاتھ روک لے ستم گر......جنت کے پھولوں کا سہاگ مت لوٹ....چمنستان قدس کی نازک کلیوں کو گھائل مت کر....بن باپ کے دکھیاروں کا کچھ تو خیال کر۔

پھر مامتا کی جھونک میں اُٹھی اور اس کے قدموں پر اپنا سر رکھتے ہوئے کہنے لگی:

"لے، میرا سر کچل کر اپنی ہوس کی آگ بجھالے، لیکن جناب فاطمہ کے جگر پاروں کو بخش دے۔"

غصے میں چور سنگدل شوہر نے اسے اتنے زور کی ٹھوکر ماری کہ وہ پتھر کے ایک ستون سے ٹکرا کر لہولہان ہوگئی۔

طمانچہ مارتے مارتے جب تھک گیا تو شقی ازلی نے دونوں بھائیوں کی مشکیں کسیں اور غلاف کعبہ کی لٹکتی ہوئی زلفوں کو زور سے کھینچا اور آپس میں ایک دوسرے سے باندھ دیا۔

دہشت سے بچوں کا خون سوکھ گیا۔ حلق کی آواز پھنس گئی۔ آنکھوں کے آنسو ہو خشک گئے۔

اس کے بعد سیہ بخت یہ کہتا ہوا کوٹھری کے باہر نکل آیا:

"جس قدر تڑپنا ہے، صبح تک تڑپ لو۔ دن نکلتے ہی میری چمکتی ہوئی تلوار تمہیں ہمیشہ کے لیے چین کی نیند سلا دے گی۔"

دروازہ مقفل تھا۔ اس لیے اندر کا حال تو خدا جانے۔ ویسے جانوں میں اب تاب ہی کہاں تھی کہ نالوں کا شور بلند ہوتا۔ البتہ زنداں کی کوٹھری سے تھوڑے وقفے پر آہستہ آہستہ کراہنے کی آواز صاف سنائی پڑتی تھی۔

بلا لاؤ قیامت کو.... بڑا ناز ہے اُسے مناظر کی ہولناکی پر... سوا نیزے والے آفتاب کی روشنی میں وہ بھی سیدہ کے شیر خوار بچوں کی اسیری کا تماشہ دیکھ لے.....

اور ذرا محشریوں کو بڑھ کے آواز دو..... وہ بھی گواہ ہو جائیں کہ جس محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارۂ ابرو پر کل ان کی بیڑیاں ٹوٹ کے گرنے والی ہیں، آج انہیں کی گود کے لاڈلے زنجیروں میں سسک رہے ہیں۔

ہائے رے! مقامِ بلند کی قیامت آرائیاں .... بڑے بڑے لالہ رخوں، مہ جبینوں اور گل رویوں کا نگار خانۂ جمال تو نے دن دہاڑے لوٹ لیا.... اور تیرے خلاف کہیں دادفریاد بھی نہیں ہو سکی ہے۔

ارمانوں کے خون کی سرخیاں لیے لرزتی کانپتی سحر طلوع ہوئی۔ گھنے بادلوں کی اوٹ میں منہ چھپائے سورج نکلا۔ جوں ہی دشمن ایمان نے اپنی خوں آشام تلوار اٹھائی، زہر میں بجھا ہوا خنجر سنبھالا اور خونخوار درندے کی طرح کوٹھری کی طرف لپکا، نیک بخت بیوی نے دوڑ کر پیچھے سے اس کی کمر تھام لی۔ جفا کار نے اتنے زور کا اسے جھٹکا دیا کہ سر ایک دیوار سے ٹکرا گیا اور وہ آہ کر کے زمین پر گر پڑی۔

بیوی کو گھائل کرنے کے بعد جوش غضب میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ہاتھ میں ننگی تلوار اور چمکتا ہوا خنجر دیکھ کر دونوں بھائی لرز گئے۔ خوف سے نرگسی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ابھی وہ اس ہولناک دہشت سے کانپ ہی رہے تھے کہ سیہ بخت نے آگے بڑھ کر دونوں بھائیوں کی زلفیں پکڑیں اور نہایت بے دردی کے ساتھ انہیں گھسیٹتا ہوا باہر لایا۔ تکلیف کی شدت سے معصوم بچے تلملا اٹھے۔ پچھاڑیں کھا کھا کر اس کے قدموں پر سر پٹخنے لگے۔ ٹوٹ ٹوٹ کر آہ وفریاد کرنے لگے، لیکن سنگدل کو ترس نہ آنا تھا، نہ آیا۔

لہو میں شرابور پاک طینت بی بی پھر اٹھی اور بپھری ہوئی شیرنی کی طرح گرجتے ہوئے کہا:

''آخر گھسیٹ کر کہاں لے جا رہا ہے، ان بے گناہ مسافروں کو؟ دشمنی تھی تو ان کے باپ سے تھی۔ چار دن کے معصوم بچوں سے کیا دشمنی ہے، جو تو ان کا خون بہانے پر تلا ہوا ہے۔''

''ساری دنیا یتیم بچوں پر ترس کھاتی ہے اور تو رات سے انہیں شکنجے میں کسے ہوئے ہے۔ تھپڑوں سے مار مار کر تو نے ان کا پھول سا چہرہ لہولہان کر دیا ہے۔ رحمتوں کی گھٹا کی طرح لٹکتی ہوئی زلفوں کو تو اتنی بے دردی کے ساتھ گھسیٹ رہا ہے کہ بالوں کی جڑوں سے خون بہنے لگا۔''

''رات سے اب تک مدینے کے یہ نازنین بے آب و دانہ لگا تار تیرے ظلم و ستم کی چوٹ کھا رہے ہیں اور تجھے ان کی کم سنی پر بھی ترس نہیں آتا۔ پردیس میں ان کا کوئی حامی و مددگار نہیں ہے۔ اس لیے بے سہارا سمجھ کر تو انہیں تڑپا تڑپا کے مار رہا ہے۔ تو جس نبی کا کلمہ پڑھتا ہے، وہ اگر اپنی تربت سے نکل آئیں تو کیا ان کے روبرو بھی تو ان کے نازنین شہزادوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کر سکے گا؟''

''تیرے بازوؤں میں بڑا کس بل ہے تو کسی کڑیل جوان سے پنجہ لڑا، دودھ پیتے بچوں پہ کیا اپنی شہ زوری دکھلاتا ہے؟''

اس کے سینے میں غیرت ایمانی کا جوش اُبل پڑا تھا۔ اپنی جان پر کھیل کر اب وہ رفاقت حق کا آخری فیصلہ کر دینا چاہتی تھی۔

جذبات میں بے قابو ہو کر اس نے جیسے ہی بچوں کو اس کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کی، بدبخت نے ایک بھرپور ہاتھ کا گھونسا اس کے سینے پر مارا اور وہ غش کھا کر زمین پر گر پڑی۔ لونڈی سامنے آئی تو وہ بھی اس کی تیغ ستم سے گھائل ہو گئی۔

اس کے بعد شکنجے میں کسے ہوئے دونوں بھائیوں کو گھسیٹ کر باہر لایا اور سامان کی طرح ایک خچر پر لاد کر دریائے فرات کی طرف چل پڑا۔

رسیوں میں جکڑے ہوئے امام مسلم رضی اللہ عنہ کے یتیم بچے اب مقتل کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ مایوس چہروں پہ بے بسی کی حسرت برس رہی تھی۔ دم بہ دم دلوں کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ رہ رہ کے بچھڑی ہوئی ماں کی آغوش شفقت، پیار و محبت کا گہوارہ، مدینے کا دارالامان اور حجرۂ عائشہ میں گیتی کی آخری پناہ گاہ، یاد آ رہی تھی۔

کچلے ہوئے ارمانوں کے ہجوم میں چھوٹے بھائی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ طویل خاموشی کے بعد اب آنسوؤں کا تھما ہوا طوفان اُبل پڑا۔ بڑے بھائی نے آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

"جانِ عزیز صبر کرو۔ ہمت سے کام لو۔ اب اس دنیائے فانی میں گنتی کی چند سانسیں باقی رہ گئی ہیں، انہیں بے تابیوں کے ہیجان میں رائیگاں مت کرو۔"

"وہ دیکھو..... دریائے فرات کی سطح پر چشمۂ کوثر کی سفید موجیں، ہمیں سر اُٹھا کے دیکھ رہی ہیں..... اب اس جہان فانی سے اپنا لنگر اُٹھا لو..... چند ہی قدم کے بعد عالم جاوید کی سرحد شروع ہو رہی ہے..... بس دو گھڑی میں ہم اس جفا پیشہ دنیا کی دسترس سے باہر نکل جائیں گے۔"

تھوڑی دور چلنے کے بعد دریائے فرات نظر آنے لگے لگا۔ جلاد نے اپنی تلوار چمکاتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا:

"سانپ کے بچو!..... دیکھ لو اپنا مقتل..... یہیں تمہارا سر قلم کر کے سارے جہان کے لیے ایک عبرت ناک تماشا چھوڑ جاؤں گا۔"

یہ سن کر بچوں کا خون سوکھ گیا۔ کنارے پہنچ کر شقی ازلی نے انہیں خچر سے اتارا۔ مشکیں کھولیں اور اپنے سامنے کھڑا کیا۔

اب دونوں کھلی آنکھوں سے سر پہ منڈلاتی ہوئی قضا دیکھ رہے تھے۔ بے بسی کے عالم میں ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آسمان کی طرف تکنے لگے۔

جوں ہی بھویں تانے، تیور چڑھائے، قتل کے ارادے سے اس نے اپنی تلوار بے نیام کی، مظلوم بچوں نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر رحم کی درخواست کی۔ اتنے میں ہانپتی کانپتی، گرتی پڑتی پیکرِ وفا بی بی بھی آ پہنچی۔ آتے ہی اس نے پیچھے سے اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک عاجز و درماندہ کی طرح خوشامد کرتے ہوئے کہا:

"خدا کے لیے اب بھی مان جاؤ..... آلِ رسول کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین مت کرو..... رحم و غمگساری کے جذبے میں ذرا ایک بار آنکھ اٹھا کر دیکھو..... بچوں کی ننھی جان سوکھی جا رہی ہے..... تلوار سامنے سے ہٹا لو۔"

نفس کا شیطان پوری طرح مسلط ہو چکا تھا۔ ساری منت وسماجت بیکار چلی گئی۔ غصے میں بھرپور تلوار کا ایک وار بیوی پر چلایا، وہ پیکر ایمان گھائل ہو کر تڑپنے لگی۔ بچے یہ دردناک منظر دیکھ کر سہم گئے۔ اب سیہ بخت جلاد اپنی خون آلود تلوار لے کر بچوں کی طرف بڑھا۔ چھوٹے پر وار کرنا ہی چاہتا تھا کہ بڑا بھائی چیخ اُٹھا:

''خدارا پہلے مجھے ذبح کرو.... جان سے زیادہ عزیز بھائی کی تڑپتی ہوئی لاش میں نہیں دیکھ سکوں گا۔''

چھوٹے بھائی نے سر جھکاتے ہوئے خوشامد کی:

''اپنے بڑے بھائی کے قتل کا منظر مجھ سے ہرگز نہ دیکھا جا سکے گا۔ خدا کے لیے پہلے میرا سر قلم کرو۔''

اس لرزہ خیز منظر پر عالم قدس میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ شہنشاہ کونین کلیجہ تھامے ہوئے مشیت کی ادا پر صابر وشاکر تھے۔ سیدہ کی روح مچل مچل کر عرش الٰہی کی طرف بڑھ رہی تھی کہ عالم گیتی کو تہ وبالا کر دے، لیکن قدم قدم پر رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پرنم آنکھوں کا اشارہ انہیں روک رہا تھا۔

حیدر خیبر شکن اپنی تیغ ذوالفقار لیے ہوئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنبش لب کے منتظر تھے کہ آن واحد میں جفا شعاروں کو کیفر کردار تک پہنچا دیں..... روح الامین بال و پر گرائے دم بخود تھے....... رضواں کوثر و تسنیم کا ساغر لیے انتظار میں کھڑا تھا.... عالم برزخ میں ہلچل مچی ہوئی تھی...... ملکوت اعلیٰ پر سکتہ طاری تھا کہ ایک مرتبہ بجلی چمکی ستارہ ٹوٹا ......اور فضا میں دو ننھی چیخیں بلند ہوئیں۔

مرکز عالم ہل گیا..... چشم فلک جھپک گئی...... ہوائیں رک گئیں..... دھارے تھم گئے اور دھرتی کا کلیجہ شق ہو گیا...... حیرت کا طلسم ٹوٹا تو امام مسلم رضی اللہ علیہ وسلم کے یتیم بچوں کے کٹے ہوئے سر خون میں تڑپ رہے تھے............ اور لاشیں دریائے فرات کی لہروں کی گود میں ڈوبتی جا رہی تھیں۔

سلام ہو تم پر اے محمد وابراہیم.....اے امام مسلم کے راج دلارو.....تمہارے مقدس خون کی سرخی سے آج تک گلشن اسلام کی بہاروں کا سہاگ قائم ہے۔

خدائے غافر وقدیر تمہاری ننھی تربتوں پر شام وسحر رحمت ونور کی بارش برسائے۔ ۱

پروانے کا حال اس محفل میں ہے قابل رشک اے اہل نظر
اک شب ہی میں یہ پیدا بھی ہوا عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

۱۔اس مضمون میں ''معصوم'' کا لفظ جہاں بھی مذکور ہے، وہ ان معنوں میں مستعمل نہیں ہے، جن معنوں میں شیعہ فرقہ کے یہاں رائج ہے۔

فاطمی چمن کی زخمی کلی

گلشن کے سارے پھول لٹ گئے۔ دوپہر کی دھوپ میں ہرا بھرا چمن تاراج ہوگیا۔ اب شاخ گل سے ٹپکتا ہوا خون اور روندی ہوئی پنکھڑی کا تماشا دیکھنے کے لیے اکیلا باغباں رہ گیا ہے۔ صبح سے اب تک سفینۂ اہل بیت کے سارے ناخدا ایک ایک کر کے کوثر کی موجوں میں ڈوب گئے۔ حرم کی شہزادیوں، کاشانۂ نبوت کی مستورات اور تاراج کارواں کے آخری محافظ امام حسین بھی اب پابہ رکاب ہیں۔ بادیدۂ پرنم خیمے میں داخل ہوتے ہیں۔ حضرت شہربانو، حضرت زینب، حضرت سکینہ اور عابد بیمار کے اداس چہرے سامنے ہیں۔ زندگی بھر کی رفیقۂ حیات نوشیرواں کی پوتی حضرت شہربانو سے کچھ کہنا ہے۔ ماں کی اداؤں کا آئینہ، سگی بہن حضرت زینب کو سمجھانا ہے۔ لخت جگر، بیٹی حضرت فاطمہ کو تسلی دینی ہے اور خاندان کی آخری امیدگاہ، نور نظر حضرت عابد بیمار کو کچھ وصیت کرنی ہے۔

خیمے میں کہرام بپا ہے، سوئی ہوئی قیامت جاگ اٹھی ہے اور ارمانوں کی دنیا لٹ رہی ہے، گھر کا تاجدار ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہا ہے، یتیمی آواز دے رہی ہے، بیوگی دروازے پر کھڑی ہے۔

کلیجہ توڑ دینے والی آواز میں حضرت شہر بانو کی زبان سے بس ایک جملہ نکلا اور ضبط وشکیب کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ دبا ہوا اندوہ کا آتش فشاں پھوٹ پڑا:

"ہمارے سرتاج سب جاچکے ہیں...... اب آپ بھی نانا جان کے حضور میں جارہے ہیں...... جائیے اس مبارک سفر سے کون روک سکتا ہے آپ کو؟

لیکن اے میرے کشورِ حیات کے والی! اتنا بتا جائیے کہ آپ کے بعد رسول اللہ کی بیٹیوں کا نگہبان کون ہوگا؟..... آل ہاشم کے یتیم کس کا منہ تکیں گے؟.... کس محرم کی ہمراہی میں ہم مدینہ واپس لوٹیں گے؟.... بیمار صغریٰ آپ کو پوچھے گی تو ہم اسے کیا جواب دیں گے؟..... شیر خوار علی اصغر کا مچلتا ہوا ناز اب کون اٹھائے گا؟..... حرم میں بیٹھنے والے کس چراغ کی روشنی میں اپنے نبی کی کتاب پڑھیں گے اور مدینے والے نانا جان کی تربت پر کسے اپنا سفارشی بنا کر لے جائیں گے؟...... ارمانوں کے لاشریک امیدگاہ سب جاچکے، اب آپ بھی جارہے ہیں۔...... ہائے یہ صدمہ ہم سے کیسے برداشت ہوگا؟.... آپ کے بعد ہم کیسے جی سکیں گے۔"

یہ کہتے کہتے آواز بند ہوگئی۔ زمین پر غش کھا کر گر پڑیں۔ امام مظلوم نے سنبھالا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سکون ہوا، تو امام عالی مقام نے صبر و تشفی کے کلمات تلقین فرمائے۔ آبدیدہ آنکھوں سے شیر خوار بچے کا پیار لیا اور اہل خیمہ کو بلکتا تڑپتا چھوڑ کر میدان کی طرف روانہ ہوگئے۔ جوں ہی تھوڑی دور چلے تھے کہ خیمے سے نالہ و گریہ کا شور بلند ہوا۔ پلٹ کر خیمے میں واپس تشریف لائے۔

حضرت شہر بانو نے اضطراب کی حالت میں کہا:

"یہ دیکھیے، شیر خوار علی اصغر کی آنکھیں پتھرا رہی ہیں۔ کئی دن کا بھوکا پیاسا بچہ اب دم توڑ رہا ہے۔ زبان سوکھ گئی ہے۔ گل قدس کی پتیاں مرجھا گئی ہیں۔ اب بھی پانی کے چند قطرے مل جائیں، تو زندگی کی آس بندھ جاتی۔ لے جائیے! اشقیا کے سامنے،...... شاید انہیں رحم آجائے۔

موت وحیات کی کشمکش میں تڑپتے ہوئے بچے کو گود میں لے کر امام عالی مقام باہر تشریف لائے۔ لشکر اعداء کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا:

"دیکھو یہ شیر خوار بچہ ہے۔ کئی دن کے فاقہ سے ماں کا دودھ خشک ہو گیا ہے۔ کل سے اس کے حلق کے نیچے کچھ نہیں اترا۔ بھوک اور پیاس کی شدت سے اب یہ موت کی ہچکیاں لے رہا ہے۔ اس نیم جان بچے پہ اگر تمہیں ترس آسکے، تو چند قطرے پانی کے دے دو۔ ساقی کوثر کے نواسے، تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔ دشمنی ہم سے ہے، اس شیر خوار بچے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟....اور اگر کسی رشتے کا لحاظ نہ کر سکو تو کم از کم انسانیت ہی کے ناطے سے ایک جاں بلب بچے پر رحم کرو۔"

امام عالی مقام حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہما کی یہ دردانگیز تقریر سن کر اشقیا نے ترس کھانے کے بجائے جواب دیا:

"سانپ کا بچہ سانپ ہی ہوتا ہے۔ جب تک گھٹنے ٹیک کر آپ یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کر لیتے، ہم کسی طرح کی ہمدردی آپ کے ساتھ نہیں کر سکتے۔"

اس کے بعد ایک شقی ازلی نے کمان پر تیر چڑھا کر جو نشانہ لگایا، تو شیر خوار علی اصغر کا حلقوم چھیدتا ہوا امام کے بازو میں پیوست ہو گیا۔ فاطمی چمن کی زخمی کلی ذرا سی تڑپی اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ موج فرات شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ امام نے بچے کے خون سے شرابور چہرہ آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا:

"بے نیاز خداوند! ذبح ہونے والے جانوروں کے لیے بھی عمر کی قید ہے، مگر آج اپنے محبوب کے گھر کی یہ ننھی قربانی قبول فرمائے۔"

ظلم و جفا کی دنیا سے منہ پھیر کر سو جانے والے قدسی مسافر کو گود میں لیے ہوئے جب حضرت امام خیمے میں پہنچے، تو شہر بانو نے دوڑ کر پوچھا:

"بچہ پر سکون حالت میں نظر آرہا ہے۔ شاید اس کی بے چینی کا علاج ہو گیا ہے۔"

امام نے بچے کی ٹھنڈی لاش ماں کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا:

"لو، تمہارا بچہ اب کبھی بے چین نہیں ہوگا۔ اسے ہمیشہ کے لئے سکون مل گیا ہے۔"

ہائے......آج فاطمہ کی کوکھ شیر خوار بچے سے بھی خالی ہو گئی۔

تاراج کارواں

کربلا کی دوپہر کے بعد کی رقت انگیز داستان سننے سے پہلے ایک لرزہ خیز اور درد ناک منظر نگاہوں کے سامنے لایئے۔

صبح سے دوپہر تک خاندانِ نبوت کے تمام چشم و چراغ جملہ اعوان و انصار ایک ایک کرکے شہید ہوگئے۔ سب نے دمِ رُخصت دل کی زخمی سطح پر ایک نئے داغ کا اضافہ کیا۔ ہر تڑپتی ہوئی لاش کی آخری ہچکیوں پر امامِ عالی مقام میدان میں پہنچے، گود میں اُٹھایا، خیمے تک لائے، زانو پہ سر رکھا اور جاں نثار نے دم توڑ دیا۔

نظر کے سامنے جن لاشوں کا انبار ہے، ان میں جگر کے ٹکڑے بھی ہیں اور آنکھ کے تارے بھی..... بھائی اور بہن کے لاڈلے بھی اور باپ کی نشانیاں بھی....... ان بے گور دکفن جنازوں پر کون ماتم کرے؟..... کون آنسو بہائے اور کون جلتی ہوئی آنکھوں پر تسکین کا مرہم رکھے؟

تنہا ایک حسین اور دونوں جہاں کی امیدوں کا ہجوم، ایک عجب درد انگیز بے بسی کا عالم ہے۔ قدم قدم پر نئی قیامت کھڑی ہوئی ہے۔ نفس نفس میں الم و اندوہ کے نئے نئے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔

دوسری طرف حرم نبوت کی خواتین ہیں، رسول اللہ کی بیٹیاں ہیں، سوگوار مائیں اور آشفتہ حال بہنیں ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں، جن کی گودیں خالی ہوچکی ہیں، جن کے سینوں سے اولاد کی جدائی کا زخم رِس رہا ہے، جن کی گود سے شیر خوار بچہ بھی چھین لیا گیا ہے اور جن کے بھائیوں، بھتیجوں اور بھانجوں کی بے گوروکفن لاشیں سامنے پڑی ہوئی ہیں۔

روتے روتے آنکھوں کا چشمہ سوکھ گیا ہے۔ تن نیم جاں میں اب تڑپنے کی سکت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ عورت ذات کے دل کا آبگینہ یوں ہی نازک ہوتا ہے، ذراسی ٹھیس جو برداشت نہیں کرسکتا...... آہ! اس پر آج پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔

سب کے سب جام شہادت نوش کر چکے۔ اب تنہا ایک ابن حیدر کی ذات باقی رہ گئی ہے، جو لٹے ہوئے قافلے کی آخری امید گاہ ہیں۔

آہ! اب وہ بھی رخت سفر باندھ رہے ہیں۔ خیمے میں ایک کہرام برپا ہے۔ کبھی بہن کو تسکین دیتے ہیں، کبھی شہربانو کو تلقین فرمارہے ہیں، کبھی لخت جگر عابد بیمار کو گلے سے لگاتے ہیں اور کبھی کمسن بہنوں اور لاڈلی شہزادیوں کو یاس بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ امید وبیم کی کشمکش ہے، فرض کا تصادم ہے۔ خون کا رشتہ دامن کھینچتا ہے اور ایمان مقتل کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔

کبھی یہ خیال آتا ہے کہ ہمارے بعد اہل خیمہ کا کیا حال ہوگا؟... پردیس میں حرم کے یتیموں اور بیواؤں کے ساتھ دشمن کیا سلوک کریں گے؟

دوسری طرف شوق شہادت دامن گیر ہے۔ ملت کی تطہیر اور حمایت حق کا فرض نیزوں پر چڑھ کے آواز دے رہا ہے۔

بالآخر اہل بیت کے ناخدا، کعبہ کے پاسبان، نانا جان کی شریعت کے محافظ، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ بھی اب سر پر کفن باندھ کر رَن میں جانے کے لیے تیار ہوگئے۔

اہل حرم کو تڑپتا، بلکتا اور سسکتا چھوڑ کر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ خیمہ سے باہر نکلے اور لشکر اعدا کے سامنے کھڑے ہوگئے۔

اب ذرا ٹھہر جائیے اور آنکھیں بند کر کے منظر کا جائزہ لیجیے۔ ساری داستان میں یہی وہ مقام ہے، جہاں انسان کا کلیجہ شق ہو جاتا ہے، بلکہ پتھروں کا جگر بھی پانی ہو کر بہنے لگتا ہے۔ تین دن کا ایک بھوکا پیاسا مسافر تن تنہا بائیس ہزار تلواروں کے نرغے میں ہے۔ دشمنوں کی خوں ریز یلغار چاروں طرف سے بڑھتی چلی آ رہی ہے۔

دروازے پر اہل بیت کی مستورات اشکبار آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہی ہیں۔ لمحہ لمحہ درد و غم کے اتھاہ ساگر میں دل ڈوبتا جا رہا ہے۔ کبھی منہ سے چیخ نکلتی ہے، کبھی آنکھیں جھپک جاتی ہیں۔

ہائے رے تسلیم و رضا کی وادیٔ بے اماں...... پھولوں کی پنکھڑی پہ قدم رکھنے والی شہزادیاں آج انگاروں پر لوٹ رہی ہیں.... جن کے اشارۂ ابرو سے ڈوبا ہوا سورج پلٹ آتا ہے، آج انہیں کے ارمانوں کا سفینہ نظر کے سامنے ڈوب رہا ہے اور زبان نہیں کھلتی۔

دیکھنے والی آنکھیں اپنے امیر کشور کو، اپنے مرکز امید کو، اپنے پیارے حسین کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں کہ ایک نشانے پر ہزاروں تیر چلے، تلواریں بے نیام ہوئیں، فضا میں نیزوں کی انی چمکی اور دیکھتے ہی دیکھتے فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا چاند گہن میں آ گیا۔

زخموں سے چور، خون میں شرابور، سیدہ کا راج دلارا، جیسے ہی فرش پر گرا کائنات کا سینہ دہل گیا، کعبے کی دیواریں ہل گئیں، چشم فلک نے خون برسایا، خورشید نے شرم سے منہ ڈھانپ لیا اور گیتی کی ساری فضا ماتم و اندوہ سے بھر گئی۔

اُدھر ارواح طیبات اور ملائکہ رحمت کے جلو میں جب شہید اعظم کی مقدس روح عالم بالا میں پہنچی، تو ہر طرف ابن حیدر کی امامت و یکتائی کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا۔

اِدھر خیمے میں ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی اور صبر و شکیب کا خرمن جل رہا تھا۔

یتیموں، بیواؤں اور سوگواروں کی آہ و فغاں سے دھرتی کا کلیجہ پھٹ گیا، امیدوں کی دنیا لٹ گئی..... آہ! بیچ منجدھار میں کشتی کا ناخدا بھی چل بسا۔

اب بنو ہاشم کے یتیم کہاں جائیں؟ کس کا منہ تکیں؟ کاشانۂ نبوت کی وہ

شہزادیاں، جن کی عفت سرا میں روح الامین بھی بغیر اجازت کے داخل نہ ہوں، نسیم صبا بھی جن کے آنچلوں کے قریب پہنچ کر ادب کے سانچے میں ڈھل جائے، آج کربلا کے میدان میں کون ان کا محرم ہے، جس سے اپنے دکھ درد کی بات کہیں؟

ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیے کہ ہمارے یہاں ایک میت ہو جاتی ہے تو گھر والوں کا کیا حال ہوتا ہے؟ غم گساروں کی بھیڑ اور چارہ گروں کی تلقین صبر کے باوجود آنسو نہیں تھمتے، اضطراب کی آگ نہیں بجھتی اور نالہ و فریاد کا شور کم نہیں ہوتا، پھر کربلا کے میدان میں حرم کی ان سوگوار عورتوں پر کیا گزری ہوگی، جن کے سامنے بیٹوں، شوہروں اور عزیزوں کی لاشوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ جو غم گساروں اور شریک حال ہمدردوں کے جھرمٹ میں نہیں، خوں خوار دشمنوں اور سفاک درندوں کے نرغے میں تھیں۔

امامِ عالی مقام کا سر قلم کرنے کے بعد کوفیوں نے بدن کے پیراہن اتار لیے۔ جسم اطہر پر نیزے کے بتیس زخم اور تلوار کے چونتیس گھاؤ تھے۔ ابن سعد کے حکم پر یزیدی فوج کے دس نابکاروں نے سیدہ کے لخت جگر کی نعش کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا۔

حضرت زینب اور شہر بانو خیمے سے یہ لرزہ خیز منظر دیکھ کر بلبلا اٹھیں اور چیخ مار کر زمین پر گر پڑیں۔ اس کے بعد شمر اور ابن سعد دندناتے ہوئے خیمے کی طرف بڑھے۔ بدبخت شمر نے اندر گھس کر پردہ نشینان حرم کی چادریں چھین لیں اور سامان لوٹ لیا۔

حضرت زینب بنت علی نے غیرت و اضطراب کی آگ میں سلگتے ہوئے کہا:

''شمر! تیری آنکھیں پھوٹ جائیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں کو بے پردہ کرنا چاہتا ہے۔ ہمارے چہروں کے محافظ شہید ہو گئے۔ اب دنیا میں ہمارا کوئی نہیں ہے۔ یہ مانا کہ ہماری بے بسی نے تجھے دلیر بنا دیا ہے، لیکن کیا کلمہ پڑھانے کا احسان بھی تو بھول گیا؟''

''سنگ دل ظالم! ناموس محمد کی بے حرمتی کر کے قہر خداوندی کو حرکت میں نہ لا۔ تجھے اتنا لحاظ بھی نہیں ہے کہ ہم اسی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسیاں ہیں، جس نے حاتم طائی کی قیدی لڑکی کو اپنی چادر اڑھائی تھی۔''

حضرت زینب کی گرجتی ہوئی آواز سن کر عابد بیمار لڑکھڑاتے ہوئے اپنے بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور شمر پر تلوار اٹھانا چاہتے تھے کہ ضعف ونقاہت سے زمین پر گر پڑے۔

شمر نے یہ معلوم کرنے کے بعد کہ یہ امام حسین رضی اللہ عنہ کی آخری نشانی ہے، اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے بھی قتل کر ڈالو، تا کہ حسین رضی اللہ عنہ کا نام ونشان دنیا سے بالکل مٹ جائے، لیکن ابن سعد نے اس رائے سے اتفاق نہ کیا اور یہ معاملہ یزید کے حکم پر چھوڑ دیا۔

شام ہو چکی تھی۔ یزیدی فوج کے سردار جشن فتح میں مشغول ہو گئے۔ ایک پہر رات گئے تک سرور ونشاط کی مجلس گرم رہی۔

اِدھر خیمے والوں کی یہ شام غریباں قیامت سے کم نہیں تھی۔ حرم کے پاسبانوں کے گھر میں چراغ بھی نہیں جل سکا تھا۔ ساری فضا سوگ میں ڈوب گئی تھی۔ مقتل میں امام کا کچلا ہوا لاشہ بے گوروکفن پڑا تھا۔ خیمے کے قریب گلشن زہرا کے پامال پھولوں پر دردناک حسرت برس رہی تھی۔ رات کی بھیانک اور وحشت خیز تاریکی میں اہل خیمہ چونک پڑتے تھے۔

زندگی کی یہ پہلی سوگوار اور اُداس رات حضرت زینب اور شہر بانو رضی اللہ عنہما سے کاٹے نہیں کٹ رہی تھی۔ رات بھر خیمے سے سسکیوں کی آواز آتی رہی، آہوں کا دھواں اٹھتا رہا اور روحوں کے قافلے اترتے رہے۔ آج پہلی رات تھی کہ خدا کا گھر بسانے کے لیے اہل حرم نے سب کچھ لٹا دیا تھا۔ پردیس، چٹیل میدان، مقتل کی زمین، خاک وخون میں لپٹے ہوئے چہرے، میت کا گھر، بالیں کے قریب ہی بیمار کے کراہنے کی آواز، بھوک و پیاس کی ناتوانی، خونخوار درندوں کا نرغہ، مستقبل کا اندیشہ، ہجر وفراق کی آگ.........آہ! کلیجہ شق کر دینے والے سارے اسباب مقتل کی پہلی رات میں جمع ہو گئے تھے۔

بڑی مشکل سے صبح ہوئی، اُجالا پھیلا اور دن چڑھنے پر ابن سعد اپنے چند سپاہیوں کے ساتھ اونٹنی لے کر آیا۔ اس کی ننگی پیٹھ پر حضرت زینب، حضرت شہر بانو اور حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہم سوار کرائے گئے۔ پھول کی طرح نرم ونازک ہاتھوں کو رسیوں سے جکڑ دیا گیا۔ عابد بیمار رضی اللہ عنہ اپنی والدہ اور پھوپھی کے ساتھ اس طرح باندھ دیے گئے کہ جنبش بھی نہیں کر سکتے تھے۔

دوسرے اونٹوں پر باقی خواتین اور بچیاں اسی طرح رسیوں میں بندھی ہوئی سوار کرائی گئیں۔ اہل بیت کا یہ لٹا پٹا قافلہ جس وقت کربلا کے میدان سے رخصت ہوا، اُس وقت کا قیامت خیز منظر ضبط تحریر سے باہر ہے۔

واقعۂ کربلا کے ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ خولی جگر گوشۂ بتول کا سر مبارک نیزے پر لٹکائے ہوئے اسیران حرم کے اونٹ کے آگے آگے تھا اور پیچھے ۷۲ شہداء کے کٹے ہوئے سر دوسرے اشقیا لیے ہوئے تھے۔

خاندان رسالت کا یہ تاراج قافلہ جب مقتل کے قریب سے گزرنے لگا، تو حضرت امام رضی اللہ عنہ کی بے گور و کفن نعش اور دیگر شہدائے حرم کے جنازوں پر نظر پڑتے ہی خواتین اہل بیت بتیاب ہوگئیں۔ دل کی چوٹ ضبط نہ ہوسکی۔ آہ و فریاد کی صدا سے کربلا کی زمین ہل گئی۔ عابد بیمار رضی اللہ عنہ شدت اضطراب سے غش پہ غش کھا رہے تھے اور حضرت شہر بانو رضی اللہ عنہا انہیں کسی طرح سنبھالا دے رہی تھیں۔ قیامت کا یہ دل گداز منظر دیکھ کر پتھروں کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔

فاطمہ کی لاڈلی بیٹی حضرت زینب کا حال سب سے زیادہ رقت انگیز تھا۔ صدمۂ جانکاہ کی بے خودی میں انہوں نے مدینے کی طرف رُخ کر لیا اور دل ہلا دینے والی آواز میں اپنے نانا جان کو مخاطب کیا:

''یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ پر آسمان کے فرشتوں کا سلام ہو۔ یہ دیکھیے، آپ کا لاڈلا حسین ریگستان میں پڑا ہے۔ خاک و خون میں آلودہ ہے۔ اعضائے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ نعش کو گور و کفن بھی میسر نہیں ہے۔''

''نانا جان! آپ کی تمام اولاد قتل کر دی گئی۔ ہوا ان پر خاک اڑا رہی ہے۔ آپ کی بیٹیاں قید میں ہیں، ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، مشکیں کسی ہوئی ہیں، پردیس میں کوئی ان کا یار و شناسا نہیں........ نانا جان! اپنے یتیموں کی فریاد کو پہنچ جائیے۔''

ابن جریر کا بیان ہے کہ دوست اور دشمن کوئی ایسا نہ تھا، جو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے اس بیان پر آبدیدہ نہ ہو گیا ہو۔

اسیران حرم کا قافلہ اشکبار آنکھوں اور جگر گداز سسکیوں کے ساتھ کربلا سے رخصت ہو کر کوفے کی طرف روانہ ہو گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ ایک پہاڑ کے دامن میں یزیدی فوج کے سرداروں نے پڑاؤ کیا۔ اسیران اہل بیت اپنی اپنی سواریوں سے نیچے اتار لیے گئے۔

چاندنی رات تھی، رسیوں میں جکڑے ہوئے حرم کے یہ قیدی رات بھر سسکتے رہے۔ پیشانی میں مچلتے ہوئے سجدوں کے لیے بھی ظالموں نے رسیوں کی بندھن ڈھیلی نہیں کی۔ پچھلے پہر حضرت زینب رضی اللہ عنہا مناجات میں مشغول تھیں کہ ابن سعد قریب آیا اور اس نے طنز کرتے ہوئے دریافت کیا:

''قیدیوں کا کیا حال ہے؟''

کئی بار پوچھنے کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے منہ ڈھانپ کر جواب دیا:

''خدا کا شکر ہے۔ نبی کا چمن تاراج ہو گیا۔ ان کی اولاد قید کر لی گئی۔ رسیوں سے تمام جسم نیلے پڑ گئے ہیں۔ ایک بیمار جو نیم جاں ہو چکا ہے، اس پر بھی تجھ کو ترس نہیں آتا.....اور نہیں تو ہماری بے کسی کا تماشا دکھانے اب تو ہمیں ابن زیاد اور یزید کی قربان گاہ میں لے جا رہا ہے۔''

اتنا کہتے کہتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ نے پھوپھی کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

''خون کے قاتلوں سے جور و ستم کا شکوہ ہی کیا ہے؟....... پھوپھی جان!''

''بس ایک آرزو ہے کہ بابا جان کا سر میری گود میں کوئی لا کر ڈال دے اور میں اسے اپنے سینے سے لگا لوں۔''

ابن سعد نے کہا:

'' گود میں نہیں، تیرے قدموں کی ٹھوکر پہ ڈال سکتا ہوں، اگر راضی ہو تو اقرار کر۔''

ظالم نے پھر زخموں پر نمک چھڑکا، پھر حرم کے قیدی تلملا اٹھے۔ اضطراب میں بجھی ہوئی ایک آواز کان میں آئی:

'' بد بخت! نوجوانان جنت کے سردار کے ساتھ گستاخی کرتا ہے۔ کیا تجھے خبر نہیں ہے کہ یہ کٹا ہوا سر اب بھی دو جہان کا مالک ہے؟''

" ذرا غور سے دیکھ!.... بوسہ گاہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر انوار و تجلیات کی کیسی بارش ہو رہی ہے؟...... صرف جسم سے رابطہ ٹوٹ گیا ہے، عرش کا رابطہ اب بھی قائم ہے۔"

اس آواز پر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ اِسی عالم اندوہ میں اسیران اہل بیت کا یہ تاراج قافلہ کوفہ پہنچا۔ مارے شرم و ہیبت کے ابن سعد نے شہر کے باہر جنگل میں قیام کیا۔

رات کے سناٹے میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا مناجات و دعا میں مشغول تھیں کہ اتنے میں ایک ہلکی سی آواز کان میں آئی:

"بی بی میں حاضر ہو سکتی ہوں؟"

نگاہ اٹھا کر دیکھا تو ایک بڑھیا سر پر چادر ڈالے، منہ چھپائے سامنے کھڑی ہے۔

اجازت ملتے ہی قدموں پر گر پڑی اور دست بستہ عرض کیا:

"میں ایک غریب محتاج عورت ہوں۔ بھوکے پیاسے آل رسول کے لیے تھوڑا سا کھانا اور پانی لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ بی بی میں غیر نہیں ہوں۔ ایک مدت تک شہزادی رسول سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی کنیزی کا شرف حاصل رہا ہے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے، جبکہ سیدہ کی گود میں ایک ننھی منی بچی تھی، جس کا نام زینب تھا۔"

حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اُبلتے ہوئے جذبات پر قابو پا کر جواب دیا:

" تو نے اس جنگل اور پردیس میں ہم مظلوموں کی مہمان نوازی کی۔ ہماری دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔ خدا تجھے دارین میں خوشی عطا فرمائے۔"

بڑھیا کو جب معلوم ہوا کہ یہی حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہیں، تو چیخ مار کر گلے سے لپٹ گئی اور اپنی جان بنت رسول کے قدموں پر نثار کر دی۔

عشق و اخلاص کی تاریخ میں ایک نئے شہید کا اور اضافہ ہوا۔

دوسرے دن ظہر کے وقت اہل بیت کا لٹا ہوا کارواں کوفے کی آبادی میں داخل ہوا۔ بازار میں دونوں طرف سنگدل تماشائیوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ خاندان نبوت کی بیبیاں شرم و غیرت سے گڑی جا رہی تھیں۔ سجدے میں سر جھکا لیا تھا کہ معصوم چہروں پر غیر محرم کی نظر نہ پڑ سکے۔ وفور غم سے آنکھیں اشکبار تھیں۔ دل رو رہے تھے۔ اس احساس سے

زخموں کی ٹیس اور بڑھ گئی تھی کہ کربلا کے میدان میں قیامت ٹوٹنا تھی ،ٹوٹ گئی ،اب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس کو گلی گلی پھرایا بھی جارہا ہے۔

کلمہ پڑھنے والی امت کی غیرت دفن ہوگئی تھی۔ خوشی کے جشن میں سارا کوفہ ننگا ناچ رہا تھا۔ ابن زیاد کے بے غیرت سپاہی فتح کا نعرہ بلند کرتے ہوئے آگے آگے چل رہے تھے۔ جب اہل بیت کی سواری قلعہ کے قریب پہنچی ،تو ابن زیاد کی بیٹی فاطمہ اپنے منہ پر نقاب ڈالے ہوئے باہر نکلی اور خاموش دور کھڑی حسرت کی نظر سے یہ منظر دیکھتی رہی۔

ابن زیاد اور شمر کے حکم سے سیدانیاں اُتاری گئیں۔ عابد بیمار رضی اللہ عنہ اپنی والدہ اور پھوپھی کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ ادھر بخار کی شدت سے ضعف و ناتوانی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اونٹ سے اترتے وقت غش آگیا اور بے حال ہو کر زمین پر گر پڑے۔ سر زخمی ہوگیا۔ خون کا فوارہ چھوٹنے لگا۔ یہ دیکھ کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا بیتاب ہوگئیں۔ دل بھر آیا۔ ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ کہنے لگیں۔

''آل فاطمہ میں ایک ہی عابد بیمار کا خون محفوظ رہ گیا تھا، چلو اچھا ہوا کوفے کی زمین پر یہ قرض بھی ادا ہو گیا۔''

ابن زیاد کا دربار نہایت تزک و احتشام سے آراستہ کیا گیا تھا۔ فتح کے نشے میں سرشار تخت پر بیٹھا ہوا ابن زیاد اپنی فوج کے سرداروں کی زبانی کربلا کے واقعات سن رہا تھا۔

سامنے ایک طشت میں امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کا سرمبارک رکھا ہوا تھا۔ ابن زیاد کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ وہ بار بار حضرت امام رضی اللہ عنہ کے لبہائے مبارک کے ساتھ گستاخی کرتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ اسی منہ سے خلافت کا دعویدار تھا، دیکھ لیا قدرت کا فیصلہ! ......حق سربلند ہوا، باطل کو ذلت نصیب ہوئی۔

صحابی رسول حضرت زید ابن ارقم رضی اللہ عنہ اُس وقت دربار میں موجود تھے۔ ان سے یہ گستاخی دیکھی نہ گئی۔ جوش عقیدت میں چیخ پڑے:

''ظالم! یہ کیا کرتا ہے؟.....چھڑی ہٹالے! نسبت رسول کا احترام کر.... میں نے بارہا سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس چہرے کا بوسہ لیتے ہوئے دیکھا ہے۔''

ابن زیاد نے غصہ سے پیچ وتاب کھاتے ہوئے کہا:

''تو اگر صحابیٔ رسول نہ ہوتا تو میں تیرا سر قلم کروا دیتا۔''

حضرت ابن ارقم رضی اللہ عنہ نے حالت غیظ میں جواب دیا:

''اتنا ہی تجھے رسول اللہ کی نسبت کا خیال ہوتا، تو ان کے جگر گوشوں کو تو کبھی قتل نہ کراتا۔ تجھے ذرا بھی غیرت نہیں آئی کہ جس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تو کلمہ پڑھتا ہے، انہیں کی اولاد کو تہہ تیغ کرایا ہے اور اب ان کی عفت مآب بیٹیوں کو قیدی بنا کر گلی گلی پھرا رہا ہے۔''

ابن زیاد یہ زلزلہ خیز جواب سن کر تلملا گیا، لیکن مصلحتاً خون کا گھونٹ پی کے رہ گیا۔

اسیران حرم کے ساتھ ایک بوسیدہ چادر میں لپٹی ہوئی حضرت زینب رضی اللہ عنہا ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی کنیزوں نے انہیں اپنے جھرمٹ میں لے لیا تھا۔ ابن زیاد کی نظر ان پر پڑی تو دریافت کیا:

''یہ کون عورت ہے؟''

کئی بار پوچھنے پر ایک کنیز نے جواب دیا:

''زینب بنت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہا)''۔

ابن زیاد نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''خدا نے تیرے سرکش سردار اور تیرے اہل بیت کے نافرمان باغیوں کی طرف سے میرا دل ٹھنڈا کر دیا۔''

اس اذیت ناک جملے پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنے آپ کو سنبھال نہ سکیں اور بے اختیار رو پڑیں:

''واللہ! تو نے میرے سردار کو قتل کر ڈالا۔ میرے خاندان کا نشان مٹایا۔ میری شاخیں کاٹ دیں۔ میری جڑ اکھاڑ دی۔ اگر اس سے تیرا دل ٹھنڈا ہو سکتا ہے، تو ہو جائے۔''

اس کے بعد ابن زیاد کی نظر عابد بیمار رضی اللہ عنہ پر پڑی۔ وہ انہیں بھی قتل کرنا ہی چاہتا تھا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا بے قرار ہو کر چیخ اٹھیں:

''میں تجھے خدا کا واسطہ دیتی ہوں۔ اگر تو اس بچے کو قتل کرنا ہی چاہتا ہے، تو مجھے بھی اس کے ساتھ قتل کر ڈال۔''

ابن زیاد پر دیر تک سکتے کا عالم طاری رہا۔ اس نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا:

''خون کا رشتہ بھی کیسی عجیب چیز ہے۔ واللہ مجھے یقین ہے کہ یہ سچے دل سے لڑکے کے ساتھ قتل ہونا چاہتی ہے۔ اچھا، اسے چھوڑ دو، یہ بھی اپنے خاندان کی عورتوں کے ساتھ جائے۔''

اس بیٹھک سے فارغ ہونے کے بعد ابن زیاد نے شہر کی جامع مسجد میں لوگوں کو جمع کیا اور خطبہ دیتے ہوئے کہا:

''اُس خدا کی حمد وستائش، جس نے امیر المؤمنین یزید بن معاویہ کو غالب کیا اور کذاب ابن کذاب حسین بن علی کو ہلاک کر ڈالا۔''

اس اجتماع میں مشہور محب اہل بیت حضرت ابن عفیف رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ ان سے خطبے کے یہ الفاظ سن کر رہا نہ گیا، فرط غضب میں کانپتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور ابن زیاد کو للکارتے ہوئے کہا:

''خدا کی قسم تو ہی کذاب ابن کذاب ہے، حسین سچا، اس کا باپ سچا، اس کے نانا سچے۔''

ابن زیاد اس جواب سے تلملا اٹھا اور جلاد کو حکم دیا کہ شاہراہ عام پر لے جا کر اس بڈھے کا سر قلم کر دو۔

ابن عفیف شوق شہادت میں مچلتے ہوئے اُٹھے اور مقتل میں پہنچ کر چمکتی ہوئی تلوار کا مسکراتے ہوئے خیر مقدم کیا۔ خون بہا، لاش تڑپی اور ہمیشہ کے لیے ٹھنڈی ہو گئی۔

کوثر کے ساحل پر جاں نثاروں کی تعداد میں ایک عدد کا اور اضافہ ہوا۔

دوسرے دن ابن زیاد نے اہل بیت کا تاراج کارواں ابن سعد کی سرکردگی میں دمشق کی طرف روانہ کیا۔ حضرت امام رضی اللہ عنہ کا سر مبارک نیزے پر آگے آگے چل رہا تھا۔ پیچھے اہل بیت کے اونٹ تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ امام عالی مقام رضی اللہ عنہ اب بھی اپنے حرم کے قافلے کی نگرانی فرما رہے ہیں۔

اثنائے سفر میں سر مبارک سے عجیب عجیب خوارق وکرامات کا ظہور ہوا۔ رات کے سناٹے میں ماتم وفغاں کی رقت انگیز صدائیں فضا میں گونجتی تھیں۔ کبھی کبھی سر مبارک کے ارد گرد نور کی کرن پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی۔

جس آبادی سے یہ قافلہ گزرتا تھا، ایک کہرام بپا ہو جاتا تھا۔ دمشق کا شہر نظر آتے ہی، یزیدی فوج کے سردار خوشی سے ناچنے لگے۔ فتح کی خوشخبری سنانے کے لیے ہر قاتل اپنی جگہ بے قرار تھا۔

سب سے پہلے زحر بن قیس نے یزید کو فتح کی خبر سنائی:

"حسین ابن علی اپنے اٹھارہ اہل بیت اور ساٹھ اعوان وانصار کے ساتھ ہم تک پہنچے۔ ہم نے چند گھنٹے میں ان کا قلع قمع کر دیا۔ اس وقت کربلا کے ریگستان میں ان کے لاشے برہنہ پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے کپڑے خون میں تربتر ہیں۔ ان کے رخسار گرد وغبار سے میلے ہو رہے ہیں۔ ان کے جسم دھوپ کی تمازت اور ہوا کی شدت سے خشک ہو گئے ہیں۔"

پہلے تو فتح کی خوشخبری سن کر یزید جھوم اُٹھا، لیکن اس زلزلہ خیز اور ہلاکت آفریں اقدام کا ہولناک انجام جب نظر کے سامنے آیا، تو کانپ کے رہ گیا۔

بار بار چھاتی پیٹتا تھا کہ ہائے! اس واقعہ نے ہمیشہ کے لیے مجھے ننگ اسلام بنا دیا۔ مسلمانوں کے دلوں میں میرے لیے نفرت ودشمنی کی آگ ہمیشہ سلگتی رہے گی۔ قاتل کی پشیمانی مقتول کی اہمیت تو بڑھا سکتی ہے، لیکن قتل کا الزام نہیں اُٹھا سکتی۔

ویسے، اس مقام پر بہت سے لوگوں نے دھوکہ کھایا ہے۔ انہیں نفسیاتی طور پر صورت حال کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

بہرکیف، اس کے بعد یزید نے شام کے سرداروں کو اپنی مجلس میں بلایا۔ اہل بیت کو بھی جمع کیا اور امام زین العابدین سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"اے علی! تمہارے ہی باپ نے میرا رشتہ کاٹا۔ میری حکومت چھیننا چاہی۔ اس پر خدا نے جو کچھ کیا، وہ تم دیکھ رہے ہو؟"

اس کے جواب میں امام زین العابدین رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کی ایک آیت پڑھی، جس کا مفہوم یہ ہے کہ تمہاری کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے، جو پہلے سے نہ لکھی ہو۔

دیر تک خاموشی رہی۔ پھر یزید نے شامی سرداروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

''اہل بیت کے ان اسیروں کے بارے میں تمہارا کیا مشورہ ہے؟''

بعض شقی القلب حاضر باشوں نے نہایت سخت کلامی کے ساتھ بدسلوکی کا مشورہ دیا، مگر نعمان ابن بشیر نے کہا کہ ان کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اس حال میں دیکھ کر کرتے۔

یزید نے حکم دیا کہ سارے اسیروں کی رسیاں کھول دی جائیں اور سیدانیوں کو شاہی محل میں پہنچا دیا جائے۔

یہ سن کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا رو پڑیں اور انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا:

''تو اپنی حکومت میں رسول زادیوں کو گلی گلی پھرا چکا۔ اب ہماری بے بسی کا تماشہ اپنی عورتوں کو نہ دکھا۔ ہم خاک نشینوں کو کوئی ٹوٹی پھوٹی جگہ دے دے جہاں سر چھپا لیں۔''

بالآخر یزید نے ان کے قیام کے لیے علیحدہ مکان کا انتظام کیا۔

امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کا سر مبارک یزید کے سامنے رکھا ہوا تھا اور بد بخت اپنے ہاتھ کی چھڑی کے ساتھ پیشانی مبارک کی گستاخی کر رہا تھا۔ صحابی رسول حضرت اسلمی رضی اللہ عنہ نے ڈانٹتے ہوئے کہا:

''ظالم!...... یہ بوسہ گاہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے، اس کا احترام کر۔''

یزید یہ سن کر تلملا گیا۔ صحابی رسول کے خلاف کچھ کرنے کی ہمت نہ ہو سکی۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی خواہش پر سر مبارک ان کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ سامنے رکھ کر روتی رہتی تھیں۔ کبھی حضرت شہر بانو اور ام رباب رضی اللہ عنہما اسے سینے سے لگائے بیتے ہوئے دنوں کی یاد میں کھو جاتیں۔

ایک رات کا ذکر ہے، جب کہ نصف شب گزر چکی تھی۔ سارے دمشق پر نیند کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اہل بیت کے مصائب پر ستاروں کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ اچانک

سادات کی قیام گاہ سے کسی عورت کا نالہ بلند ہوا۔ محل کی دیواریں ہل گئیں۔ دل کی آگ سے فضا میں چنگاریاں اُڑنے لگیں۔ یزید دہشت سے کانپنے لگا۔ جا کر دیکھا تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنے بھائی کا سر گود میں لیے ہوئے بلبلا رہی ہیں۔ درد و کرب کی ایک قیامت جاگ اُٹھی ہے۔ اس درد انگیز نالے سے اس کے دل میں جو دہشت سمائی، وہ عمر کی آخری سانس تک نکل نہ سکی۔

اسے اندیشہ ہو گیا کہ کلیجہ توڑ دینے والی یہ فریاد اگر دمشق کے در و دیوار سے ٹکرا گئی تو شاہی محل کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی، کیونکہ دمشق کی جامع مسجد میں حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ نے اہل بیت کے فضائل و مناقب اور یزید کے مظالم پر مشتمل جو تاریخی خطبہ دیا تھا، اس نے لوگوں کے دل ہلا دیئے تھے اور ماحول میں اس کی اثر انگیزی اب تک باقی تھی۔

اگر تقریر کا سلسلہ کچھ دیر اور جاری رہتا اور یزید نے گھبرا کر اذان نہ دلوا دی ہوتی، تو اُسی دن یزید کے شاہی اقتدار کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی اور اس کے خلاف عام بغاوت پھیل جاتی۔

اس لیے دوسرے ہی دن نعمان ابن بشیر کی سرکردگی میں مع تیس سواروں کے، اہل بیت کا یہ تاراج کارواں اُس نے مدینے کی طرف روانہ کر دیا۔

ہزار کوشش کی کہ کربلا کی یہ دہکتی ہوئی چنگاری کسی طرح ٹھنڈی ہو جائے، لیکن جو آگ بحر و بر میں لگ چکی تھی، اس کا سرد ہونا ممکن نہیں تھا۔ صبح کی نماز کے بعد اہل بیت کا دلگداز قافلہ مدینے کے لیے روانہ ہو گیا۔

حضرت نعمان ابن بشیر بہت رقیق القلب، پاکباز اور محب اہل بیت تھے۔ دمشق کی آبادی سے جوں ہی قافلہ باہر نکلا، حضرت نعمان نے امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر دست بستہ عرض کیا:

''یہ نیاز مند حکم کا غلام ہے، جہاں جی چاہے، تشریف لے جایئے۔ میری تکلیف کا خیال نہ کیجیے۔ جہاں حکم دیجیے گا، پڑاؤ کروں گا اور جب فرمایئے گا، کوچ کروں گا۔''

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ وہیں سے کربلا واپس ہوئے اور شہدائے اہل بیت کو دفن کیا، جب کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کربلا کے آس پاس کی آبادیوں کو جب خبر ہوئی تو وہ ماتم کناں آئے اور شہیدوں کی تجہیز و تکفین کا فرض انجام دیا۔ ویسے، آخرالذکر روایت زیادہ قابل اعتماد ہے۔

حضرت امام عالی مقام کا سر مبارک اب نیزے پر نہیں تھا، بلکہ حضرت زینب و شہر بانو اور عابد بیمار رضی اللہ عنہم کی گود میں تھا۔ پہاڑوں، صحراؤں اور ریگستانوں کو عبور کرتا ہوا یہ مقدس قافلہ مدینے کی طرف بڑھتا رہا۔

منزلیں بدلتی رہیں اور سینے کے جذبات مچلتے رہے، یہاں تک کہ کئی دنوں کے بعد اب حجاز کی سرحد شروع ہوگئی۔ اچانک سویا ہوا درد جاگ اُٹھا۔ رحمت و نور کی شہزادیاں اپنے چمن کا موسم بہار یاد کر کے مچل گئیں۔ کربلا جاتے ہوئے انہی راہوں سے کبھی گزرے تھے۔ کشور امامت کی یہ رانیاں اس وقت اپنے تاجداروں اور ناز برداروں کے ظل عاطفت میں تھیں۔ زندگی شام و سحر کی مسکراہٹوں سے معمور تھی۔ کلیوں سے لے کر غنچوں تک سارا چمن ہرا بھرا تھا۔ ذرا چہرہ اداس ہوا، چارہ گروں کا ہجوم لگ گیا۔ پلکوں پہ ننھا سا قطرہ چمکا اور پیار کے ساگر میں طوفان اُمنڈنے لگا۔ سوتے میں ذرا سا چونک گئے اور آنکھوں کی نیند اڑ گئی۔ اب اسی راہ سے لوٹ رہے ہیں تو قدموں کے نیچے کانٹوں کی برچھیاں کھڑی ہیں۔ تڑپ تڑپ کر قیامت بھی سر پہ اٹھا لیں تو کوئی تسکین دینے والا نہیں۔ خیمہ اُجڑا پڑا ہے۔ قافلہ ویران ہو چکا ہے۔ شہزادوں اور رانیوں کی جگہ اب آشفتہ حال یتیموں اور بیواؤں کی ایک جماعت ہے، جس کے سر پہ اب صرف آسمان کا سایہ رہ گیا ہے۔ لبوں کی جنبش اور ابرو کے اشاروں سے اسیروں کی زنجیر توڑنے والے، آج خود اسیر کرب و بلا ہیں۔

مدینے کی مسافت گھٹتے گھٹتے اب چند منزل رہ گئی ہے۔ ابھی سے پہاڑوں کا جگر کانپ رہا ہے۔ زمین کی چھاتی دہل رہی ہے۔ قیامت کو پسینہ آ رہا ہے کہ کربلا کے فریادی مالک کونین کے پاس جا رہے ہیں۔ قافلے میں حسین رضی اللہ عنہ نہیں ہیں، اُن کا کٹا ہوا سر چل رہا ہے۔ استغاثے کے ثبوت کے لیے کہیں سے گواہ لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بغیر

دھڑ کا حسین، جب اپنے نانا جان کی تربت پر حاضر کیا جائے گا تو خاکدان گیتی کا انجام دیکھنے کے لیے کس کے ہوش سلامت رہ جائیں گے؟

پردیس میں کربلا کے مسافروں کی آج آخری رات تھی، جو نہایت بیقراری میں کٹی۔ انگاروں پر کروٹ بدلتے رہے۔ صبح سویرے ہی کوچ کے لیے تیار ہو گئے۔

نعمان بن بشیر آگے آگے چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے اہل بیت کی سواریاں تھیں۔ سب سے اخیر میں تمیں محافظ سپاہیوں کا مسلح دستہ تھا۔

دوپہر کے بعد مدینے کی سرحد شروع ہو گئی۔ اب فریادیوں کا حال بدلنے لگا۔ سینے کی آگ تیز ہونے لگی۔ جیسے جیسے مدینہ قریب آتا جارہا تھا، جذبات کے سمندر میں طوفان کا تلاطم بڑھتا جاتا تھا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد اب پہاڑیاں نظر آنے لگیں۔ کھجوروں کی قطار اور سبزہ زاروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جوں ہی مدینے کی آبادی چمکی، صبر و شکیب کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ کلیجہ توڑ کر آہوں کا دھواں نکلا اور ساری فضا پہ چھا گیا۔ ارمانوں کا گہوارہ دیکھ کر دل کی چوٹ اُبھر آئی۔ حضرت زینب، حضرت شہربانو اور حضرت عابد بیمار رضی اللہ عنہم اُبلتے ہوئے جذبات کی تاب نہ لا سکے۔ اہل حرم کے دردناک نالوں سے زمین کانپنے لگی۔ پتھروں کا کلیجہ پھٹ گیا۔

ایک سانڈنی سوار نے بجلی کی طرح سارے مدینے میں یہ خبر دوڑا دی کہ کربلا سے نبی زادوں کا لٹا ہوا قافلہ آ رہا ہے۔ شہزادۂ رسول کا کٹا ہوا سر بھی ان کے ساتھ ہے۔ یہ خبر سنتے ہی ہر طرف کہرام مچ گیا۔ قیامت سے پہلے قیامت آ گئی۔ وفورِ غم اور جذبۂ بے خودی میں اہل مدینہ باہر نکل آئے۔ جیسے ہی آمنا سامنا ہوا اور نگاہیں چار ہوئیں، دونوں طرف شورش غم کی قیامت ٹوٹ پڑی۔ آہ و فغاں کے شور سے مدینے کا آسمان دہل گیا۔ حضرت امام کا کٹا ہوا سر دیکھ کر لوگ بے قابو ہو گئے۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ ہر گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا فریاد کرتی ہوئی مدینہ میں داخل ہوئیں۔

"نانا جان! اُٹھیے، اب قیامت کا کوئی دن نہیں آئے گا۔ آپ کا سارا کنبہ لٹ گیا۔ آپ کے لاڈلے شہید ہو گئے۔ آپ کے بعد آپ کی اُمت نے ہمارا سہاگ چھین لیا۔

بے آب ودانہ آپ کے بچوں کو تڑپا تڑپا کے مارا۔ آپ کا لاڈلا حسین آپ کے نام کی دھائی دیتا ہوا دنیا سے چل بسا۔ کربلا کے میدان میں ہمارے جگر کے ٹکڑے ہماری نگاہوں کے سامنے ذبح کیے گئے۔ آپ کے پیار کا سینچا ہوا چمن تاراج ہو گیا...... نانا جان!''

''نانا جان! یہ حسین کا کٹا ہوا سر لیجیے۔ آپ کے انتظار میں اس کی آنکھیں اب تک کھلی ہوئی ہیں۔ ذرا مرقد سے نکل کر اپنی آشفتہ نصیب بیٹیوں کا دردناک حال دیکھیے۔''

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی اس پکار سے سننے والوں کے کلیجے پھٹ گئے۔

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ، حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت عبداللہ ابن جعفر طیار اور حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہم کی رقت انگیز کیفیت تاب ضبط سے باہر تھی۔ حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کے گھر کے بچے یہ مرثیہ پڑھ رہے تھے:

'' قیامت کے دن وہ امت کیا جواب دے گی، جب اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پوچھے گا کہ تم نے ہمارے بعد ہماری اولاد کے ساتھ یہی سلوک کیا کہ ان میں سے بعض خاک وخون میں لپٹے ہوئے ہیں۔ تلواروں، تیروں اور نیزوں سے ان کے جسم گھائل ہیں۔ ان کی لاشیں بے آب وگیاہ وادی میں پڑی ہوئی ہیں اور ان میں سے بعض قیدی ہیں۔ رسیوں کے بندھن سے ہاتھ نیلے پڑ گئے ہیں۔''

حضرت صغریٰ پچھاڑیں کھا کھا کر گر رہی تھیں۔ بار بار اپنی والدہ اور پھوپھی سے لپٹ لپٹ کر پوچھتی تھیں:

'' ہمارے بابا جان کہاں ہیں؟ ہمارے ننھے علی اصغر کو کہاں چھوڑ آئے؟ بابا جان وعدہ کر گئے تھے کہ جلد ہی وہ واپس لوٹیں گے..... جس طرح ہو، انہیں منا کے لائیے۔''

اپنے امام کا کٹا ہوا سر لیے اہل بیت کا یہ تاراج کارواں، جس دم روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہوا، ہوائیں رُک گئیں، گردش وقت ٹھہر گئی، بہتے ہوئے دھارے تھم گئے، آسمانوں میں ہلچل مچ گئی۔ پوری کائنات دم بخود تھی کہ کہیں آج ہی قیامت نہ آجائے۔

اس وقت کا دلگداز اور روح فرسا منظر ضبط تحریر سے باہر ہے۔ قلم کو یارا نہیں کہ وہ دردوالم کی وہ تصویر کھینچ سکے، جس کی یاد اہل مدینہ کو صدیوں تڑپاتی رہی۔ اہل حرم کے سوا

کسی کو نہیں معلوم کہ حجرۂ عائشہ میں کیا ہوا۔ کربلا کے فریادی اپنے نانا جان کی تربت سے کس طرح واپس لوٹے اور پروردۂ ناز کا سر مرقد انور کے باہر تھا یا رحمت کی جلوہ گاہ خاص میں؟ ویسے، جب جنت کے پھول ہی ٹھہرے تو نرگس کی چشم محرم سے اہل چمن کا کیا پردہ تھا؟..... برزخ کی دیوار تو غیروں پہ حائل ہوتی ہے، اپنی ہی گود کے پروردوں سے کیا حجاب!

حضرت زینب، حضرت شہربانو، حضرت ام رباب، حضرت عابد بیمار اور حضرت ام کلثوم اور حضرت سکینہ رضی اللہ عنہم اجمعین .... سب کے سب محرم اسرار ہی تھے۔ اندرون خانہ کیا واقعہ پیش آیا، کون جانے؟..... اشکبار آنکھوں پہ رحمت کی آستین کس طرح رکھی گئی، کربلا کے پس منظر میں مشیت الٰہی کا سربستہ راز کن لفظوں میں سمجھایا گیا؟...... پس دیوار کھڑے رہنے والوں کو عالم غیب کی ان سرگزشتوں کا حال کیا معلوم؟

مرقد رسول سے سیدہ کی خواب گاہ بھی دو ہی قدم کے فاصلے پر تھی۔ کون جانتا ہے کہ لاڈلے کو سینے سے لگانے اور اپنے یتیموں کے آنسو آنچل میں جذب کرنے کے لیے ماں کے اضطراب میں وہ بھی کسی مخفی گزرگاہ سے اپنے بابا جان کی حریم پاک تک آ گئی ہوں!

تاریخ صرف اتنا بتاتی ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے بلک بلک کر کربلا کی داستان زلزلہ خیز سنائی۔

حضرت شہربانو رضی اللہ عنہا نے کہا:

"خاندان رسالت کی بیوہ اپنا سہاگ لٹا کر در دولت پر حاضر ہے۔"

حضرت عابد بیمار رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

"یتیمی کا داغ لیے امام حسین رضی اللہ عنہ کی آخری نشانی، ایک بیمار نیم جاں، شفقت و کرم اور صبر و ضبط کی بھیک مانگتا ہے۔"

آہ و فغاں کا اُبلتا ہوا ساگر تھم جانے کے بعد شہزادۂ کونین حضرت امام عالی مقام رضی اللہ عنہ کا سر مبارک مادر مشفقہ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

دریا کا بچھڑا ہوا قطرہ، پھر دریا میں جا ملا...... پھر اُٹھتی ہوئی موجوں نے اسے آغوش میں لے ہی لیا۔

قاتلان اہل بیت کا عبرتناک انجام

مشیت ایزدی کو کربلا کے میدان میں مدارج کمال کی تکمیل کرانی تھی، وہ ہوگئی۔ جب تک محبوب کے شہزادوں اور جاں نثاروں کی لاشیں نہیں روندڈالی گئیں، بے نیازی کی پوری شان جلوہ گرتھی۔ کسی نے بھی مصیبت ٹالنے کے لیے اپنے کائنات گیراقتدار کا کوئی اختیار استعمال نہیں کیا۔

نانا جان کے اشارۂ ابرو میں کیا نہیں تھا۔ حیدر خیبر شکن کی شمشیر ذوالفقار کیا نہیں کرسکتی تھی۔ سیدہ کی آہ صبح گاہی سے کیا کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ آنے والا وقت سب کو معلوم تھا۔ بپا ہونے والے محشر آلام سے سب واقف تھے، لیکن کسی نے کچھ نہیں کیا۔

دعا بھی کی تو صبر واستقلال اور ثبات و پامردی کی، لیکن تسلیم ووفا کی راہ طے ہوتے ہی شام کی سرزمین پر قہر الٰہی کا آتش فشاں پھوٹ پڑا۔ ایک ایک گستاخ سے مواخذہ ہوا۔ ایک ایک موذی کو سزا ملی۔ دمشق سے کوفہ اور کربلا تک کے سارے ستم گرلرزادینے والی ہلاکتوں کا نشانہ بنے۔ قہر وغضب کی کڑکتی ہوئی بجلیوں سے یزیدی اقتدار کا آشیانہ جل گیا۔ زمین جل گئی۔ آبادیوں میں ہولناک وبائیں پھوٹ پڑیں۔

مختار ثقفی نام کا ایک معمولی قیدی فرط غضب میں پاؤں کی بیڑیاں توڑ کر نکل بھاگا اور انتقام کا نعرہ بلند کیا۔ دنیا اچانک اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئی۔ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ اس نے کوفے اور دمشق کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ قاتلان اہل بیت میں سے ایک ایک کو گرفتار کر کے شاہراہوں پر قتل کرایا۔

دشمنان اہل بیت کو جو سزا ملی، وہی عبرت کے لیے کافی تھی، لیکن لرز جانے کی جگہ یہ ہے کہ اس وقت سے لے کر آج تک بھرپور جذبۂ نفرت کے ساتھ نبی کی امت انہیں ٹھکراتی رہی اور قیامت تک پائے حقارت سے ٹھکراتی رہے گی۔

یہ تو دنیا کا انجام ہے، جو چند روزہ ہے۔ آخرت میں قاتلان اہل بیت کا جو ہولناک انجام ہوگا، اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ستم پیشہ یزیدیوں اور اہل بیت کے قاتلوں سے قدرت نے جو لرزہ خیز انتقام لیا اور ان کے سروں پر قہر خداوندی کی جو قیامت ٹوٹی، وہ رہتی دنیا تک کے لیے تماشائے عبرت ہے۔

اب فرداً فرداً ہر ایک قاتل کی ہلاکت خیز سرگزشت ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

یزید ابن معاویہ کا انجام

دمشق کے بھرے دربار میں اہل بیت کے ایک مظلوم نے یزید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

> ”حسین کے خون سے جس سلطنت کی بنیاد کو تو نے پانی دیا ہے، تیری اولاد بھی اس پر نہیں تھوکے گی۔“

اس جملے پر سارا دربار سناٹے میں آگیا تھا اور دلوں کی گہرائی میں یہ بات اتر گئی تھی کہ خاندان اہل بیت کے مظلوم کی یہ آہ کبھی خالی نہیں جائے گی۔

واقعۂ کربلا کے کچھ ہی دنوں کے بعد یزید ایک ہلاکت آفریں اور انتہائی موذی مرض میں مبتلا ہو گیا۔ پیٹ کے درد اور آنتوں کے زخم کی ٹیس سے وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہتا تھا۔

حمص میں جب اسے اپنی موت کا یقین ہوگیا، تو اپنے بڑے لڑکے معاویہ کو بستر مرگ پر بلایا اور سلطنت کے بارے میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ بے ساختہ بیٹے کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور نہایت ذلت وحقارت کے ساتھ یہ کہتے ہوئے باپ کی پیشکش کو ٹھکرا دیا:

''جس تخت وتاج پر آل رسول کے خون کے دھبے ہیں، میں اسے ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔ خدا اس منحوس سلطنت کی وراثت سے مجھے محروم رکھے، جس کی بنیادیں سبط رسول کے خون پر رکھی گئی ہیں۔''

یزید اپنے بیٹے کے منہ سے یہ الفاظ سن کر تڑپ گیا۔ بستر پہ پاؤں پٹکنے لگا۔

موت سے تین دن پہلے آنتیں سڑ گئیں۔ کیڑے پڑ گئے۔ تکلیف کی شدت سے خنزیر کی طرح چیختا تھا۔ پانی کا قطرہ حلق کے نیچے اترنے کے بعد نشتر کی طرح چبھنے لگتا تھا۔ عجیب قہر الٰہی کی مار تھی۔ پانی کے بغیر بھی تڑپتا تھا اور پانی پی کر بھی چیختا تھا۔ کسی حال میں اسے چین نہیں تھا۔

بالآخر پیاس کی شدت، درد کی تکلیف اور زخموں کی ٹیس سے تڑپ تڑپ کر اس کی جان نکلی۔ لاش میں ایسی ہولناک بدبو تھی کہ قریب جانا مشکل تھا۔

اس کے کفن دفن کے بعد بنوامیہ کے حامیوں نے زبردستی اس کے بیٹے کو تخت پر بٹھا دیا، لیکن وہ عالم وحشت میں چیختا ہوا بھاگا اور ایک کوٹھری میں گھس گیا۔ جب تک زندہ رہا، ''یا حسین'' کا نعرہ لگاتا رہا اور بالآخر کچھ دنوں کے بعد وہ بھی چل بسا۔

تاریخ کی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ بنوعباس کے زمانے میں جب یزید کی قبر کھودی گئی، تو اس کی ہڈیاں جل کر سیاہ ہوگئی تھیں۔ اس واقعہ سے عالم برزخ کے حالات پر تھوڑی سی روشنی پڑتی ہے۔

ابن زیاد کا انجام

امام مسلم اور ان کے یتیم بچوں کی شہادت سے لے کر کربلا کے معرکۂ خوں ریز تک، ظلم وشقاوت کی یہ ساری داستان، جس کی سرکردگی میں مرتب ہوئی ہے، اس قاتل کا نام ابن زیاد ہے۔ یزید کی ہلاکت خیز منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا الزام اسی بدبخت کی گردن پر ہے۔

مختار ثقفی کی بے اماں تلوار کوفے کی حکومت پر قبضہ کرتے ہی قاتلان اہل بیت کے خون سے اپنی پیاس بجھانے کے لیے بے نیام ہوگئی۔

ہائے رے خون ناحق کی حشر انگیزی! کل تک جس کوفے کی آبادی میں آل رسول کو پناہ دینا ناقابل معافی جرم تھا، آج اسی کی گلیوں میں مختار ثقفی کا منادی یہ اعلان کر رہا تھا کہ اہل بیت کے قاتلوں پر شہر پناہ کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ جو بھی آل رسول کے دشمنوں کو اپنے گھر میں پناہ دے گا، اسے دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ رات بھر حکومت کے جاسوس اور مختار کے سپاہی چن چن کر قاتلوں کو گرفتار کرتے رہے۔ صبح کے وقت شکنجوں میں کسے ہوئے قاتلوں کا پہلا دستہ مختار ثقفی کے سامنے پیش کیا گیا۔

اس پر نظر پڑتے ہی مختار ثقفی فرط غضب سے کانپ اٹھا اور شعلہ برساتی ہوئی آواز میں چیختے ہوئے بولا:

"سیہ کار درندو! جس نبی کا تم کلمہ پڑھتے ہو، انہیں کے لاڈلوں کو کربلا کی سرزمین پر تڑپا تڑپا کے تم نے شہید کیا ہے۔ تمہیں ذرا بھی خیال نہ آیا کہ قہر الٰہی کی تلوار آج نیام میں ہے، کل نیام سے باہر بھی نکل سکتی ہے۔

خون حسین کے انتقام میں اگر میں سارے کوفے کو موت کے گھاٹ اتار دوں، جب بھی فاطمہ کے جگر پارہ کے خون کے ایک قطرہ کی قیمت ادا نہیں ہوسکتی۔ آخرت کے عذاب سے پہلے آج دنیا ہی میں تم اپنے کرتوت کا مزہ چکھنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

نابکار قیدیوں نے کانپتے ہوئے عذر پیش کیا:

"ہم ابن سعد اور ابن زیاد کے حکم سے مجبور تھے۔"

اس پر مختار نے چیختے ہوئے کہا:

"اور ہم بے گناہ شہزادوں کے خون ناحق کا انتقام لینے کے لیے خدا اور رسول کے حکم کے آگے مجبور ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے جلاد کو حکم دیا کہ خوب تڑپا تڑپا کر ان ظالموں کو قتل کرو تا کہ اولاد بتول کی تکلیفوں کا انہیں احساس ہوسکے۔

اس کے بعد اسی طرح شام تک قاتلوں کے گرفتار دستے پیش ہوتے رہے اور کوفے کی زمین ان کے ناپاک خون سے سیراب ہوتی رہی۔

ابن زیاد کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ مختصر سا لشکر لے کر جنگل کی طرف بھاگ گیا ہے۔ یہ خبر ملتے ہی فوراً مختار ثقفی نے ابراہیم بن مالک اشتر کو ایک لشکر کے ساتھ اس کے تعاقب میں روانہ کیا۔ موصل کے قریب ابراہیم کے لشکر نے اسے پالیا۔ دونوں طرف مقابلہ ہوا۔ بالآخر ابن زیاد کو شکست ہوئی اور وہ زخمی ہو کر میدان میں گر پڑا۔ ابراہیم نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے اس کے سینے پر چڑھ گئے اور اس سے کہا:

''آج تو نے دیکھ لیا کہ خدا ظالموں سے کس طرح انتقام لیتا ہے۔ مختار ثقفی کوئی بادشاہ نہیں ہے، وہ قہر الٰہی کی ایک کڑکتی ہوئی بجلی ہے، جو پردۂ غیب سے نمودار ہوئی۔''

یہ کہہ کر خنجر نکالا اور اس کے سینے میں پیوست کر دیا۔ تڑپ تڑپ کر جب لاش ٹھنڈی ہوگئی، تو سر کاٹ کر مختار کے سامنے پیش کیا۔

مقام عبرت ہے کہ کوفے کے اسی دارالخلافہ میں جہاں کل شہزادۂ رسول کا کٹا ہوا سر طشت میں رکھا گیا تھا اور ابن زیاد ہونٹوں پہ چھڑی مار رہا تھا، آج اسی جگہ ابن زیاد کا سر رکھا ہوا تھا اور ساری دنیا اس کے چہرے پر لعنت برسا رہی تھی۔

عمرو ابن سعد کا انجام

ابن سعد ہی وہ شقی ازلی ہے، جس کی دسوں انگلیاں آل حیدر کے خون میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ جس کی کمان میں کربلا کا خوں ریز معرکہ سر ہوا اور خاندان رسالت کے لعل و جواہر خاک و خون میں آلودہ ہوئے۔ ملک رے کی حکومت کے لالچ میں اسی ظالم نے بی بی بتول کا ہرا بھرا چمن تاراج کیا۔ کوفے میں جب قہر خداوندی کی تلوار چمکی اور باغیان رسالت کا قتل عام شروع ہوا، تو یزیدی فوج کے سردار پاگل کتوں کی طرح ادھر ادھر بھاگنے لگے، لیکن مختار کے جاں باز سپاہیوں نے کسی کو زندہ نہ چھوڑا۔ شمر کو تہہ خانے سے، ابن زیاد کو پہاڑ کی کھوہ اور خولی کو جنگل سے گرفتار کر کے لے آئے۔

جس وقت ابن سعد سامنے آیا، تو مختار ثقفی کی آنکھوں سے چنگاری برسنے لگی۔

انہوں نے گرجتے ہوئے کہا:

''او دشمن رسول!.... تجھے کیا سزا دوں، جس سے دنیائے اسلام کے کلیجوں کی وہ آگ ٹھنڈی ہو جائے، جو تیرے ناپاک ہاتھوں نے کربلا میں لگائی ہے۔''

ابن سعد نے جواب دیا:

''میں بے گناہ ہوں۔ واقعات کربلا کی ساری ذمہ داری یزید اور ابن زیاد پر ہے۔ میں نے تو صرف ان کے احکام کی تعمیل کی ہے۔''

مختار کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ کانپتے ہوئے کہا:

''او ننگ اسلام!..... سچ سچ بتا، یزید اگر تیرے خون کی اولاد کے قتل کا حکم دیتا، تو کیا اس کی تعمیل کر سکتا تھا؟

یزید کے حکم کی تو نے تعمیل کی، لیکن اپنے نبی کے حکم کا جنازہ نکال دیا۔''

اسی درمیان خبر ملی کہ ابن سعد کا بیٹا حفص، جو کربلا میں امام عالی مقام کے خلاف اپنے باپ کی مدد کر رہا تھا، وہ بھی گرفتار کر کے لایا گیا ہے۔

مختار نے حکم دیا۔ اسے فوراً حاضر کیا جائے۔

جب وہ سامنے آیا تو جلاد سے کہا:

'' ابن سعد کی آنکھوں کے سامنے اس کے بیٹے کا سر تن سے جدا کرو، تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ حضرت علی اکبر اور حضرت علی اصغر کی تڑپتی ہوئی لاش دیکھ کر امام عالی مقام کے دل پر کیا گزری ہو گی۔''

جلاد نے آگے بڑھ کر جوں ہی گردن پر تلوار چلائی، ابن سعد چیخ پڑا۔

ابھی وہ اپنا سر پیٹ ہی رہا تھا کہ اشارہ پاتے ہی جلاد نے ابن سعد کی گردن بھی اڑا دی۔

اس طرح ظلم و شقاوت کے ایک بہت بڑے عفریت کی ناپاک ہستی سے دھرتی کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہوا۔

شمر کا انجام

یہ وہی سیہ بخت ہے، جس نے جگر گوشۂ رسول کی گردن پر تلوار چلائی تھی اور فاطمہ کے چاند کو خاک و خون میں ڈبویا تھا۔

ابن سعد کے قتل سے فارغ ہو کر مختار ثقفی نے اسے سامنے کھڑا کیا۔ مارے خوف و دہشت کے شمر تھر تھر کانپنے لگا۔ مختار نے گرجتے ہوئے کہا:

"نابکار ملعون!.......ذرا وہ ہاتھ اٹھا، جس سے شہزادۂ کونین کی گردن پر تو نے خنجر پھیرا تھا۔

نابنجار!.....تجھے ذرا بھی غیرت نہیں آئی کہ تو نے اپنے ہاتھوں سے کعبہ کی دیوار ڈھا دی۔ اونٹ اور بکری کی طرح فاطمہ کے لال کو ذبح کیا۔

افسوس!....حرم کا چراغ اور عرش کی قندیل تو نے پھونکوں سے بجھا دی۔

شقی القلب!.......تین دن کے بھوکے پیاسے نازنیں کو تہہ تیغ کرتے ہوئے تجھے ذرا بھی ترس نہیں آیا۔ تیرا زندہ جسم بھون کر اس کی راکھ ہواؤں میں اڑا دی جائے، جب بھی حسین کے خون کا بدلہ نہیں ہو سکے گا۔

سنگ دل قاتل!.....ذرہ ذرہ حسین کا نعرہ بلند کر رہا ہے۔ تیرے ہاتھوں نے بحر و بر میں آگ لگا دی ہے۔ اب اسے کون بجھا سکتا ہے۔"

عالم غیظ میں جوں ہی مختار نے تلوار اٹھائی، شمر نے گڑگڑاتے ہوئے کہا:

"پیاس سے تڑپ رہا ہوں۔ ایک گھونٹ پانی پلا دے۔"

مختار نے جواب دیا:

"وہ وقت یاد کر، جب تیری فوج نے فرات کی لہروں پر ۲۲ ہزار تلواروں کا پہرہ بٹھا دیا تھا اور اہل بیت کے معصوم بچے اور پردہ نشیں سیدانیاں تین شبانہ روز پانی کے ایک قطرے کو ترس کے رہ گئیں۔ تو یہاں پانی کیوں مانگ رہا ہے، تیرے لیے تو جہنم کا مائے حمیم انتظار میں ہے۔"

شمر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ مختار نے اشارہ کیا اور جلاد نے آگے بڑھ کر سر تن سے جدا کر دیا۔

خولی کا انجام

یہ وہی آتشیں نصیب ناری ہے، جس نے سبط رسول کے کلیجے میں برچھا مارا تھا اور سر کو نیزے پہ چڑھا کر خوشی میں ناچتا تھا۔

مختار کے سامنے جب وہ لایا گیا، تو بید کی طرح کانپ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مختار کے غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ جلاد کو حکم دیا کہ اس کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالو۔ جب اس کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے گئے، تو دونوں پاؤں کاٹنے کا حکم دیا۔ تکلیف کی شدت سے وہ زمین پر اچھلنے لگا۔ مختار نے کہا:

''ضبط سے کام لے۔ تیرے قتل کے بعد بھی تیری لگائی ہوئی آگ مسلمانوں کے سینے میں بھڑکتی رہے گی۔ یہ بھی تیرے اعمال کی کافی سزا ہے۔ تو جس دردناک عذاب کا مستحق ہے، اس کا سلسلہ تیری آخری ہچکیوں کے بعد شروع ہوگا۔''

دیگر اشقیا کا انجام

حرملہ بن کاہل، جس نابکار نے شیر خوار علی اصغر کے حلقوم پر تیر چلایا تھا اور باغ رسالت کا وہ ننھا سا پودا دم کے دم میں مرجھا گیا تھا۔

جب وہ بدبخت مختار کے سامنے لایا گیا تو کربلا کا وہ منظر یاد کر کے بلبلا اٹھا اور جلاد کو حکم دیا کہ حرملہ کے گلے پر تیروں کی بارش کی جائے اور نزع کے وقت آخری تیر گلے کے آر پار ہو۔ اس طرح تڑپ تڑپ کر بہت دیر میں وہ واصل جہنم ہوا۔

امام عالی مقام کی شہادت کے بعد جبار بن یزید نے آپ کا عمامہ شریف بہ نیت استہزا اپنے ناپاک سر پر رکھ لیا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں کچھ دنوں کے بعد وہ پاگل ہو گیا اور فولاد کی زنجیروں سے ٹکرا ٹکرا کر ذلت و خواری کی موت مرا۔

عبدالرحمٰن بن حصین نامی گستاخ نے خیمہ مبارک سے امام عالی مقام کا پیراہن شریف لوٹ کر پہنا تھا۔ اس گستاخی کی اسے یہ سزا ملی کہ وہ برص کی ناپاک بیماری میں مبتلا

ہو گیا۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے گھر کا کوئی شخص اس کے قریب نہیں جاتا تھا۔ کتے کی طرح اسے دانہ و پانی دیتے تھے۔ مرتے وقت اس کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔

یزیدی فوج کا ایک سپاہی اسود بن حنظلہ نے امام عالی مقام کی تلوار اپنے قبضے میں کرلی۔ اس بے ادبی کی اسے یہ سزا ملی کہ وہ جذام میں مبتلا ہو گیا۔ سارا بدن پھوٹ کر بہنے لگا۔

غرض جس جس نے بھی حرمت رسول کے ساتھ گستاخی کی تھی، سب اپنی سزا کو پہنچے۔ مرتے وقت کسی کا منہ سور کی طرح ہو گیا، کوئی پاگل کتے کی مانند بھونکتا پھرتا تھا۔

بہر حال واقعہ کربلا کے بعد خدا نے اپنی شان قہاری کے جو کرشمے دکھائے، انہیں تفصیل وار بیان کرنے کے لیے ایک مستقل دفتر کی ضرورت ہے۔ تاہم محبوبان الٰہی کے حقوق اور ان کے مقامات کی عظمت سمجھنے کے لیے اتنے واقعات بھی بہت کافی ہیں۔

ظلم کی شاخ کبھی نہیں پنپتی، شقاوتوں کا سر کبھی نہیں اونچا ہوتا، حق کی بے سروسامانی پر دلیر ہونے والوں کو دیر یا سویر سزا ضرور ملتی ہے۔ خدا ہمیں دل کی شقاوتوں سے محفوظ رکھے۔

؎

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

آج کے دور ابتلا میں وقت کے یزیدوں کی بربریت وسفاکی سے مسلمانوں کو مایوس نہیں ہونا چاہیے کہ خدا کی رحمتوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔

حق کا سورج زیادہ دیر تک گہن میں نہیں رہتا۔ مصائب کی شب دیجور کا پردہ بالآخر چاک ہو کر رہتا ہے۔ جہاں فطرت کی کتاب دستور کے یہ حقائق ہیں، وہاں یہ حقیقت بھی ہے کہ جب تک زمین کا سینہ تپ نہیں جاتا، کالی گھٹاؤں کا موسم نہیں طلوع ہوتا، جب تک انگاروں پہ نہیں تڑپایا جاتا، ایمان واسلام کا سونا نہیں نکھرتا۔

یہاں سکون کے لیے تڑپنا ضروری ہے اور آرزوئے وصال سے پہلے شب فراق کی قیامتوں کا خیر مقدم لازمی ہے۔ ہر کوشش کے بعد ایک انجام، ہر حرکت میں ایک سکون اور ہر آزمائش کے بعد ایک فیروز مند گھڑی نوشتہ کتاب فطرت ہے۔ اس معرکہ حیات میں ساری

فیروز بختی اسی کے لیے ہے، جو نبض کی آخری دھڑکن تک طوفانوں سے لڑنے کا حوصلہ رکھتا ہے اور غبار راہ کی طرح پامال ہو جانے کے بعد بھی اپنی ہمتوں کی شکست تسلیم نہیں کرتا۔

ویسے آدمی اگر مایوس نہ ہو، تو ان دیکھی چارہ گری اور غیبی دستگیری کا یقین ماتھے کی آنکھ سے ہو سکتا ہے، لیکن سارا ماتم صرف اس محرومی کا ہے کہ راہ طلب میں قدم اٹھانے والے خود ہی تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ شمع جب تک ساکن و خاموش رہتی ہے، تنہا رہتی ہے، جہاں سلگ جاتی ہے، ہزاروں چاہنے والے اسے اپنی جھرمٹ میں لے لیتے ہیں۔ مایوس ہو کر بیٹھ رہنے والوں کے لیے گورستانوں کے مدفن کے سوا یہاں اور کوئی جگہ نہیں۔

قاتلان اہل بیت کی ہلاکتوں کی یہ لرزہ خیز داستان وقت کے ان سفاکوں کے لیے تازیانہ عبرت ہے، جو اپنی اکثریت اور شاہانہ اقتدار کے غرور میں حق پرستوں کے جذبات سے کھیلتے رہے ہیں۔ جشن مسرت کے ساتھ ہماری تڑپتی ہوئی لاشوں کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ ہمارے آشیانوں سے دھواں اٹھتا ہے، تو غمگساری کے بجائے قہقہوں کا پیغام بھیجتے ہیں۔ ہمارے خون کی سرخیوں سے اپنی شراب کے ساغروں کا راگ ناپتے ہیں۔

یقین رکھنا چاہیے کہ وہ سحر جلد یا بہ دیر ضرور طلوع ہو گی، جبکہ آنکھوں کا خمار اشک کے قطروں کے ساتھ بہہ جائے گا۔ قہر الٰہی کی بجلیوں کی تلوار ایک دن ضرور بے نیام ہو گی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

کربلا کے بعد دوسرا حملہ

سوال: جناب احمد صدیقی
بنگلورسٹی، ہندوستان

جام نور کے کئی شمارے نظر سے گزرے۔ اپنے گہرے تاثرات کے اظہار کے لیے یہ دعا کافی ہے کہ خدا اسے نظر بد سے بچائے۔ 'شہید کربلا نمبر' کے اعلان سے ہمارے شہر کے مختلف حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ۱۰ اراپریل تک کی مدت کاٹے نہیں کٹ رہی ہے۔

مدعائے نگارش یہ ہے کہ ہمارے یہاں کتاب 'خلافت معاویہ ویزید' اور اس کی حمایت میں دیوبند کے رسالے پڑھ کر بہت سے لوگ ذہنی گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ محمود عباس نے تاریخی حوالوں سے واقعہ کربلا کی جو صحیح تصویر پیش کی ہے، اسے پڑھنے کے بعد محرم کا یہ سارا ہنگامۂ عقیدت بالکل لغو اور گمراہ کن معلوم ہوتا ہے۔ آپ 'شہید کربلا نمبر' میں اگر اس کتاب سے پیدا شدہ شکوک وشبہات کا ازالہ فرمادیں، تو عین نوازش ہوگی اور ہمیں امید ہے کہ اس خدمت حق کے لئے آپ عند اللہ ماجور ہوں گے۔

جواب نامہ

کس دلآزار کتاب کا نام آپ نے لے لیا۔ خدا اس کے شر سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔ جس زمانے میں وہ کتاب شائع ہوئی تھی، اسی زمانے میں حق پرستوں نے اس کی سطر سطر کی دھجیاں اڑادیں۔ مقدمات کی ترتیب، استدلال نتائج کے استخراج اور تاریخی حوالوں سے مصنف کی شرمناک بددیانتی اور حسین دشمنی کا پردہ فاش کردیا۔ اس کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کتاب ایک لمحہ کے لیے بھی قابل اعتماد ہے۔ تعجب ہے کہ لوگوں کے حافظے میں اس کی گمراہ کن یاد اب تک باقی ہے، لیکن اس کی تردید میں کئی ہزار صفحات پر مشتمل جو لٹریچرس شائع ہوئے تھے، اس کا کوئی ذکر نہیں۔

بہر حال اگر چہ اس پر قلم اٹھانے کی اب کوئی خاص ضرورت باقی نہیں ہے، لیکن آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس کے چند اہم گوشوں پر ایک سنجیدہ تنقید ملاحظہ فرمائیے۔

پوری کتاب میں محمود عباس کی حیثیت یزید کی طرف سے صفائی کے وکیل اور امام عالی مقام کے حق میں فریق مقابل کی ہے۔

وہ کربلا کے خونی واقعات کی کوئی ذمہ داری یزید یا اس کے اہلکاروں کے سر نہیں ڈالنا چاہتے۔ انہیں اس بات پر اصرار ہے کہ حادثہ کربلا کا تمام تر ذمہ دار خود حسینی قافلہ ہے۔ شہزادۂ رسول کو حکومت کا حرص کربلا کے میدان تک لے گیا اور ان ہی کے کیمپ کے چند آدمیوں کی پہل پر اچانک یہ حادثہ پیش آگیا۔

اپنے باطل مدعا کے لیے تاریخ کی جن کتابوں کا حوالہ انہوں نے بار بار استعمال کرکے عوام پر اپنی تاریخ دانی کی دھونس جمائی ہے، ان میں علامہ ابن جریر کی البدایہ والنہایہ اور علامہ بن خلدون کا مقدمہ تاریخ خاص طور پر قابل التفات ہیں۔

آج کی صحبت میں ہم اس حقیقت کی نقاب کشائی کرکے قارئین کو محو حیرت بنادینا چاہتے ہیں کہ تاریخ کی ساری کتابوں میں عباسی کے منہ پر زوردار طمانچے کے لیے سب سے زیادہ مواد ان ہی متذکرہ دونوں کتابوں میں موجود ہے۔

البدایہ والنہایہ کے مصنف اپنی کتاب میں معرکہ کربلا کی داستان کا آغاز کرتے ہوئے یہ سرخی قائم کرتے ہیں:

و ھذہ صفۃ مقتلہ رضی اللہ عنہ ،ماخوذ من کلام ائمۃ ھذا الشان، لا کما یزعمہ اھل التشیع من الکذب الصریح والبھتان۔(۱)

''یہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی سرگزشت ہے، جو اس فن کے ائمہ کی روایات سے ماخوذ ہے۔شیعوں نے واقعات کربلا کے بیان میں جس طرح افتراء غلط بیانی سے کام لیا ہے،ان نقائص سے یہ کتاب پاک ہے۔''

اس عبارت سے کتاب کی ثقاہت اور اس کے درجہ اعتبار کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، کیونکہ عباسی صاحب نے ورق ورق پر شیعی روایات اور وضعی روایات جیسے الفاظ کا حربہ استعمال کر کے ہر اس روایت اور ہر اس واقعہ کا انکار کر دیا ہے، جس سے یزید اور اس کے ساتھیوں کے کردار پر کسی طرح کی چوٹ پڑتی ہے۔

ایک اہم ترین سوال جو کہ معرکہ کربلا کی پوری داستان کا محور ہے اور اسی اساس پر موجودہ تاریخ کا ایوان کھڑا ہے، وہ یہ ہے کہ امام حسین رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کا قاتل کون ہے؟

سیکڑوں صفحات سیاہ کرنے کے باوجود عباسی صاحب کا قلم اس حقیقت کے چہرے سے نقاب کشائی نہیں کر سکا ہے کہ امام حسین واہل بیت کے قتل میں کس کا ہاتھ ہے؟

تاریخ کے طالب علم کا ذہن اور الجھ جاتا ہے، جب وہ عباسی کی کتاب میں پڑھتا ہے کہ نہ یزید نے قتل حسین کا حکم دیا اور نہ اس سے راضی تھا، نہ ابن زیاد کے دامن پر کوئی داغ ہے اور نہ ابن سعد کی تلوار پر کوئی دھبہ۔

یہ پڑھ کر اچانک پردۂ ذہن پر یہ سوال ابھر آتا ہے کہ شروع سے لے کر آخر تک سب کے سب بے گناہ و بے تعلق ہیں، تو پھر آخر حسینی قافلے کے بہتر مسافرین کی لاشیں کربلا کی خاک پر تڑپ تڑپ کر سرد کیسے ہو گئیں؟

۱۔البدایہ والنہایہ، ج:۸،ص:۱۷۲

میرا خیال ہے کہ عباسی صاحب نے اپنی کتاب میں جہاں کذب وافترا اور قیاس و تخمین کا ایک انبار جمع کرلیا ہے، وہاں اتنے جھوٹ کا اور اضافہ کردیتے کہ معاذ اللہ کربلا میں پہنچ کر حسینی قافلے نے خودکشی کرلی تو ساری مشکل حل ہوجاتی اور یزید کے دامن کا غبار جو آج اپنے چہرے پر مل رہے ہیں، اس بلاوجہ زحمت کی نوبت ہی نہ آتی۔

یزید کی حمایت کا جذبہ معتدل حالت میں ہوتا، تو یہ نکتہ عباسی صاحب کی سمجھ میں آجاتا کہ قاتل کی طرف سے خواہ کوئی کتنی ہی صفائی پیش کرلے، لیکن خود اس کا ضمیر اپنی بے گناہی پر کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ سفاکی اور قہر وجور کا نشہ اتر جانے کے بعد صرف یہ کہ جرم کا احساس ملامت کرتا ہے، بلکہ ندامت، پشیمانی اور اندیشۂ عقوبت ہمیشہ کے لیے ایک آزار بن جاتی ہے۔ علامہ ابن کثیر نے اپنی کتاب میں زید کے نفسیاتی واردات کی جو حالت بیان کی ہے، وہ بالکل اس کی کاپی ہے۔

حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لما قتل ابن زياد الحسين و من معه بعث برؤوسهم الى يزيد، فسر بقتله اولا وحسنت بذالك منزلة ابن زياد عنده ثم لم يلبث الا قليلا حتى ندم" (۱)

"جب ابن زیاد نے امام حسین اور ان کے ساتھیوں کو شہید کردیا، تو اس نے ان کے مقتول سروں کو یزید کے پاس بھیجا۔ ابتدا میں یزید نے امام حسین کے قتل پر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور ابن زیاد کی قدر ومنزلت اس کی نگاہ میں بہت بڑھ گئی۔ پھر کچھ دنوں کے بعد وہ اپنے کرتوت پر شرمسار ہوا۔"

پھر جب اندیشۂ عقوبت اور ندامت وپشیمانی کی شدت اور بڑھ گئی اور ابن زیاد کے کرتوت اور قتل حسین کے نتائج وعواقب کا صحیح اندازہ ہوا، تو یزید کف حسرت ملنے لگا۔ تلملا اٹھا اور بدحواسی کے عالم میں ابن زیاد کو کوسنے لگا:

۱۔ البدایہ والنہایہ، ج:۸، ص:۲۳۲

"فانہ بغضنی بقتلہ الی المسلمین وزرع فی قلوبھم العداوۃ، فابغضنی البر والفاجر بما استعظم الناس من قتلی حسینا، مالی ولابن مرجانہ۔"(۱)

'' اس نے حسین کو قتل کر کے مجھے مسلمانوں کی نظر میں دشمن بنا دیا اور ان کے دلوں میں میری دشمنی کا بیج بو دیا۔ اب مجھے ہر نیک و بد اپنے تئیں مبغوض سمجھے گا، کیونکہ عام لوگوں کی نگاہ میں میرا حسین کو قتل کرنا بڑی شقاوت ہے۔ ہائے افسوس! کیا انجام ہو گا میرا اور ابن مرجانہ (ابن زیاد) کا۔''

یہ دیکھیے، حق برزبان کا صحیح ترین مقام.... کہ خون ناحق کا الزام سر پر چڑھ کے بول رہا ہے اور جس کی دھمک سے ایوان دمشق کے مینارے ہل گئے ہیں۔

کیا اب بھی یزید کی بریت وصفائی کے لیے کسی تاول کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے!

؎

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

یہ مصرعہ شاید اسی موقعہ کے لیے شاعر کے ذہن میں آیا تھا۔

عباسی صاحب کی کتاب میں جو بات سب سے زیادہ دلخراش اور نا قابل برداشت ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی بحث کا حلقہ یزید کی بریت وصفائی تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ ان کا مقصد یزید کے مقابلے میں امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نیچا دکھانا اور خطا کار و گنہگار ٹھہرانا ہے۔ چنانچہ انہوں نے انتہائی شرمناک جسارت کے ساتھ شہزادۂ رسول امام عالی مقام کی محترم ذات پر خلافت اسلامیہ کے خلاف بغاوت وخروج کا الزام عائد کیا ہے اور نہایت خاموشی کے ساتھ اس کے آگے پیچھے باغیوں کے حق میں وعید عذاب اور عقوبت وسزا والی حدیثوں کا انبار جمع کر دیا ہے، تا کہ اچانک ذہن پر ایک چوٹ پڑے اور امام حسین کی عظمت اگر لوح قلب سے محو نہ ہو تو کم از کم معرض شک میں پڑ جائے۔

ا۔ البدایہ والنہایہ، ج:۸، ص:۲۳۲

بلاخوف تردید کہہ رہا ہوں کہ عباسی صاحب نے اپنی پوری کتاب ائمہ اسلام اور مسلم مورخین کے مسلک ونظر سے آزاد ہوکر لکھی ہے۔ ان کا قلم تاریخی مسلمات کے تابع نہیں، بلکہ پوری تاریخ کو انہوں نے قلم کے تابع کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ جس واقعہ کا چاہا انکار کردیا، جس روایت سے ذہن متفق نہیں ہوا، اسے وضعی کہہ دیا، جو عبارت مدعا کے خلاف ہوئی، اسے غلط کہہ ڈالا، نہ قبول ورد کا کوئی معیار ہے اور نہ انکار واقرار کا کوئی ضابطہ۔ ایک بدمست شرابی کی طرح قلم ہے کہ بہکتا پھر رہا ہے۔ یہ کہنا خلاف واقعہ نہیں ہے کہ عباسی صاحب نے سانحہ کربلا کی تاریخ لکھی نہیں، بنائی ہے۔

علم وتحقیق کے نازک ترین مرحلہ میں نیت کا اخلاص ایک لمحہ کے لیے بھی ان کا شریک عمل نہیں ہے۔ ان کے قلم کی روشنائی میں جذبات کا عنصر اتنا غالب ہوگیا ہے کہ بے لاگ تحقیق کا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔ یزید کے جذبہ حمایت میں جگہ جگہ انہوں نے ظن وتخمین اور وہم وقیاس کا جھوٹا سہارا لے کر جزم ویقین اور اذعان واعتقاد کا دامن جھٹک دیا۔

علامہ بن خلدون، جن کے متعلق عباسی صاحب نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے:

> ''ایک منفرد مثال علامہ بن خلدون کی ہے، جنہوں نے اپنے شہرۂ آفاق مقدمہ تاریخ میں بعض مشہور وضعی روایات کو نقد ودرایت سے پرکھنے کی کوشش کی ہے اور نام نہاد مورخین کے بارے میں صاف کہا کہ تاریخ کو خرافات اور واہی روایات سے انہوں نے خلط ملط کرڈالا۔''(۱)

کربلا میں امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا، اس کے بارے میں علامہ خلدون تحریر کرتے ہیں:

> **والحسین فیها شهید، مثاب وعلی حق و اجتهاد(۲)**
>
> ''حسین اپنے واقعہ قتل میں شہید اور مستحق اجر وثواب ہیں۔ اپنے اقدام میں وہ حق پر تھے اور یہ ان کا اجتہاد تھا۔''

۱۔ خلافت معاویہ ویزید، ص: ۴۷

۲ مقدمہ ابن خلدون، ص: ۲۷۱

عباسی صاحب کے حق میں امام حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کی راستی پر اس سے زیادہ مستند شہادت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اب عباسی صاحب میں اگر کچھ بھی جرأت ہو، تو اپنے معتمد مؤرخ کا گریباں پکڑ کر پوچھیں کہ کیا بغاوت وخروج پر ثواب ملتا ہے اور اس راہ میں جو قتل کر دیا جائے، اسے شہید کہتے ہیں؟

کیا اس صراحت کے بعد کہ ''امام حسین رضی اللہ عنہ یزید کے خلاف اپنے اقدام میں حق پر تھے''، کسی بحث کی گنجائش رہ جاتی ہے؟

اخیر میں علامہ نے ان لوگوں کے خیالات کا شدت کے ساتھ رد کیا ہے، جو کہتے ہیں کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ جدال وقتال فتنۂ بغاوت فرو کرنے کی جہت سے جائز تھا اور یزید نے اپنا شرعی حق استعمال کیا۔

ذیل میں ایسے خیالات کی تردید ملاحظہ فرمائیے:

"وقد غلط القاضی ابوبکر ابن العربی المالکی فی هذا فقال فی کتابه الذی سماه بالعواصم والقواصم، ما معناه ان الحسین قتل بشرع جده و هو غلط، حمله علیه الغفلة عن اشتراط الامام العادل، و من اعدل من الحسین فی زمانه فی امامة وعدالة فی قتال اهل الاراء۔"(۱)

یعنی'' قاضی ابوبکر ابن عربی مالکی نے اپنی کتاب العواصم والقواصم میں یہ کہہ کر سخت غلطی کی ہے کہ امام حسین اپنے نانا کی شریعت کے مطابق قتل کیے گئے۔ غلطی کی وجہ یہ ہے کہ شریعت نے امام کے خلاف کھڑے ہونے والے کے لیے قتل کی جو سزا تجویز کی ہے، وہاں شرط یہ ہے کہ وہ امام عادل ہو۔ قاضی صاحب نے امام عادل کی اس شرط کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حسین کے زمانے میں ملت کی امامت وسرداری کے لیے امام حسین سے زیادہ عادل کامل کون ہو سکتا تھا۔''

۱۔ مقدمہ ابن خلدون، ص ۱۸۱

یہ وہی قاضی ابوبکر بن عربی اوران کی کتاب ''العواصم والقواصم'' ہے، عباسی صاحب نے جس کا حوالہ اپنی کتاب کے صفحہ ۵۲ پر شدومد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خود ان کے معتمد مورخ علامہ بن خلدون نے قاضی صاحب کے استدلال کی دھجیاں اڑا دیں۔ تعجب ہے کہ اس کے باوجود عباسی نے قاضی صاحب کے قول پر اعتماد کیا ہے۔ لیکن اب یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس طرح کی خیانت وتحریف اور نقائص واسقام سے پوری کتاب لبریز ہے۔

یہیں سے عباسی صاحب کی پیش کردہ ان تمام حدیثوں کا صحیح محل بھی متعین ہوگیا، جو امام المسلمین کے خلاف خروج واقدام سے متعلق وعید عقوبت وعذاب پر مشتمل ہیں۔ یعنی وہ تمام حدیثیں ان لوگوں کے حق میں ہیں، جو امام عادل کے خلاف خروج کریں۔ یزید جیسے سلطان جائر کو ان حدیثوں کے دامن میں پناہ لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

اب ذرا تاریخ کے آئینہ میں یزید کی سیرت وکردار اور اس کے جور وستم کی داستان ملاحظہ فرمایئے اور فیصلہ کیجئے کہ کیا ملت اسلامیہ کے ایک امام عادل کی یہی زندگی ہوسکتی ہے؟

علامہ ابن کثیر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"وقد روی ان یزید کان قداشتھر بالمعازف و شرب الخمر والغنا والصید واتخاذ الغلمان والقیان والکلاب والنکاح بین الکباش والدباب والقرد ومامن یوم الایصبح فیه مخمورا وکان یشد القرد علی افرس مسرجة بجلل ویسوق و یلبس القرد قلانس الذھب و کذلک الغلمان و کان یسابق بین الخیل و کان اذامات القرد حزن علیه"(۱)

''نقل وروایت سے ثابت ہے کہ یزید سرود ونغمہ ساز وراگ، شراب نوشی اور سیر وشکار کے اندر اپنے زمانے میں مشہور تھا۔ نوعمر لڑکوں، گانے والی دوشیزاؤں اور کتوں کو اپنے گرد جمع رکھتا تھا۔ سینگ والے لڑاکا مینڈھوں، سانڈھوں اور بندروں کے درمیان لڑائی کا مقابلہ

۱۔ البدایہ والنہایہ: ج ۸، ص: ۲۳۶

کروایا تھا۔ ہر دن صبح کے وقت نشہ میں مخمور رہتا تھا۔ زین کسے ہوئے گھوڑوں پر بندروں کو رسی سے باندھ دیتا تھا اور پھراتا تھا۔ بندروں اور نوعمر لڑکوں کو سونے کی ٹوپیاں پہناتا تھا۔ گھوڑوں کے درمیان دوڑ کا مقابلہ کراتا تھا۔ جب کوئی بندر مر جاتا تو اس کا سوگ مناتا تھا۔''

ملاحظہ فرمایئے! اسی کرتوت پر عباسی صاحب آج تیرہ سو برس کے بعد واویلا مچا رہے ہیں کہ امام حسین نے یزید کو ملت اسلام کا امیر وخلیفہ کیوں نہیں تسلیم کیا؟

عباسی صاحب نے اپنی کتاب کے ص ۴۹ پر یزید کے ''خصال محمودہ'' شمار کرانے کے لیے 'البدایہ والنہایہ' کی جو نا تمام عبارت نقل کی ہے، وہ اتنے ہی پر نہیں ختم ہوگئی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے:

"وكان فيه ايضا اقبال على الشهوت وترك بعض الصلوٰة وامانتها فى غالب الاوقات۔"(۱)

''اور اس کے اندر شہوات نفس کی طرف میلان اور بعض نمازوں کے ترک اور اکثر اوقات میں انہیں نذر غفلت کردینے کی عادت تھی۔''

امام حسین کا صحیح موقف سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اصطلاحی ''امام المسلمین'' کی اہلیت و استقلال کے سلسلہ میں ایک اصولی بحث ذہن میں محفوظ کر لیجیے۔ علامہ ابن حزم اپنی مستند کتاب 'المحلی' میں ارشاد فرماتے ہیں:

"وصفة الامام ان يكون مجتنبا للكبائر ومستترا بالصغائر، عالما بما يخصه حسن السياسة، لان هذا الذى كلفه به."(۲)

امام کی شان یہ ہے کہ وہ کبائر سے اجتناب کرے اور صغائر کا اظہار نہ کرے۔ حسن سیاست اور تدبیر مملکت کی خصوصیات کو جانتا ہو، کیونکہ اسی بات کا وہ مکلف ہے۔

۱۔ البدایۃ، ج:۸، ص:۲۳۰
۲۔ المحلی، ج:۸، ص:۴۲۵

اسی کی چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

" فان قام علی الامام القرشی من هو خیر منه او مثله او دونه، قوتلوا کلهم معه لما ذکرنا قبلُ اِلا ان یکون جائرا ،فان کان جائرا ،فقام علیه مثله او دونه، قوتل معه القائم ،لانه منکر زائد ظهر ، فان قام علیه اعدل منه وجب ان یقاتل مع القائم ؛ لانه تغییر منکر ۔" (۱)

" پس اگر قرشی امام کے خلاف ایسا کھڑا ہوا، جو اس سے بہتر ہو یا اس کے مثل ہو یا اس سے کم ہو تو چاہیے کہ سب متحد ہو کر اس کے ساتھ قتال کریں، بجز اس کے کہ وہ امام غیر عادل ہے۔ اگر وہ امام غیر عادل ہے اور اس کے مقابلے میں ایسا شخص کھڑا ہو، جو اس کے مثل ہے، یا اس سے کم ہے، تو چاہیے کہ سب متحد ہو کر اس کے ساتھ قتال کریں اور اگر اس کے مقابلے میں ایسا شخص کھڑا ہوا، جو اس سے بہتر ہے، تو چاہیے کہ سب اس کھڑے ہونے والے کے ساتھ متحد ہو کر امام غیر عادل کے خلاف قتال کریں کہ یہ امر منکر کی تغیر ہے۔"

یہی " تغیر منکر"، ملت کی سب سے بڑی تطہیر ہے۔ قہر و جبر کا سلطان تیغ بے نیام لیے اس راہ میں ہر وقت کھڑا رہتا ہے۔ یہ راہ صرف مردان سرفروش و وفاداران جاں سپاہ کی ہے، یہاں کسی اور کا یارا نہیں۔ اسی حقیقت کی جانب سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشہور حدیث میں اشارہ فرمایا ہے۔

"افضل الجهاد کلمة حق عند سلطان جائر ۔"(۲)

" سب سے بہتر جہاد وہ کلمہ حق ہے، جو کسی جائر و غیر عادل بادشاہ کے سامنے برملا کہا جائے۔"

۱۔المحلی ، ج:۸، ص:۴۲۵

۲۔سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث:۴۰۱۱

دوسری حدیث میں فرماتے ہیں:

"من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ، فان لم یستطع فبلسانہ و ان لم یستطع، فبقلبہ و ذلک اضعف الایمان۔"(۱)

" تم میں سے جو شخص بھی کوئی برائی دیکھے، تو اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے مٹادے اور اگر اس کی قدرت نہیں ہے تو زبان سے مذمت کرے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہیں ہے، تو دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے ضعیف درجہ ہے۔"

جس کے گھر سے ملت کا چشمہ پھوٹا اور ملت سیراب ہوئی، تطہیر ملت کی ذمہ داری بھی اسی پر سب سے زیادہ تھی۔ وقت نے انہیں نہایت درد و کرب کے ساتھ پکارا اور انہوں نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیا۔ اور زمین و آسمان کی کائنات شاہد ہے کہ بلاریب وہ اس اعزاز کے مستحق تھے۔ عباسی کے معتمد مورخ ابن خلدون کی صراحت گزر چکی ہے:

" ومن اعدل من الحسین فی زمانہ فی امامتہ "

" ملت کی امامت وقیادت کے لیے حسین کے زمانے میں حسین سے زیادہ عادل وکامل اور کون ہوسکتا تھا۔"

غور سے سنیے، اعتراف کے ان کلمات میں صداقت کی روح بے محابہ بول رہی ہے۔ یزیدی عہد حکومت کے منکرات کی تغیر اور ملت کی تطہیر بھی امام عالی مقام کا بنیادی نصب العین اور یزید کے خلاف اقدام کا اصل محرک تھا۔ کربلا کے پورے سفرنامہ میں یہ حقیقت جگہ جگہ نمایاں ہے۔

چنانچہ حر تمیمی کی حراست میں طریق عذیب وقادسیہ سے کربلا کی طرف پلٹتے وقت امام نے جو تاریخی خطبہ دیا تھا، وہ آج بھی کتابوں میں محفوظ ہے۔ اقدام ونصب العین کا پس منظر سمجھنے کے لیے خطبہ کا لفظ لفظ ضمانت ہے۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس پڑھیے اور ذہن کو گزشتہ مباحث کے ساتھ متحضر رکھیے۔

۱۔ مسلم، رقم الحدیث: ۷۸

"ایھا الناس، ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: من رای سلطانا جائرا، مستحلا لحرم اللہ، ناکثا لعھد اللہ، خالفا لسنۃ رسول اللہ، یعمل فی عباد اللہ بالاثم والعدوان، فلم یغیر ماعلیہ بفعل ولا قول کان حقا علی اللہ ان یدخلہ مدخلہ، الا و ان ھولاء قد لزموا طاعۃ الشیطان وترکوا طاعۃ الرحمن و اظھروا الفساد و عطلوا الحدود واستأثروا بالفئی واحلوا حرام اللہ و حرموا حلالہ و انا احق من غیر."(۱)

''اے لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص کسی سلطان جائر کو دیکھے کہ وہ خدا کی حرام کردہ چیزوں کو حلال ٹھہرا رہا ہے، عہد الٰہی کو توڑ رہا ہے، سنت رسول اللہ کی مخالفت کر رہا ہے، اللہ کے بندوں کے ساتھ ظلم اور زیادتی کا معاملہ کرتا ہے۔ پس یہ سب کچھ دیکھنے جاننے پر بھی اپنے قول وعمل سے اس شر کو مٹا کر اپنا فرض نہیں ادا کرتا تو خدا کا تقاضائے عدل ہے کہ اسے اس کے ٹھکانے تک پہنچا دے۔ غور سے سنو! کہ ان یزیدیوں نے شیطان کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کرلیا ہے اور خدا کی بندگی کو چھوڑ رکھا ہے۔ ان لوگوں نے ہر طرف فساد برپا کردیے ہیں اور شریعت کی تعزیرات کو معطل کردیا اور سرکاری مال کو ذاتی مفاد پر خرچ کیا۔ خدا کے حرام کو حلال کیا اور اس کے حلال کو حرام کردیا۔ ان یزیدیوں کے شر کو مٹانے والوں میں سب سے زیادہ مستحق میں ہوں۔''

ذرا'' انا احق من غیر '' کا زور بیان ملاحظہ کیجیے۔ گزشتہ اوراق میں امام المسلمین کی اہلیت واستقلال سے متعلق علامہ ابن حزم کی جو عبارت نقل کی گئی ہے، اب ذرا اس کی

۱۔ کامل ابن اثیر، ج:۴، ص:۴۰

اسپرٹ میں خطبہ کے الفاظ پر غور کیجیے کہ کیا اب بھی امام کے اقدام کو غلط کہا جا سکتا ہے اور کیا اب بھی انہیں اصطلاحی باغی ٹھہرانے کے لیے علم وتحقیق کا کوئی ہلکا سا سہارا بھی مل سکتا ہے؟ یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص حدود روایت ونقل سے آزاد ہو کر اپنے دل کا عقیدہ ہی یہ بنا لے۔ نرم سے نرم لب ولہجہ میں اس طرح کے تخیل کو شقاوت وبدبختی کی پسندیدہ جسارت تو کہہ سکتے ہیں، لیکن اسے علم وتحقیق کا مفاد ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

بحث کے اختتام پر بے ساختہ ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، جس کا ازالہ بہت ضروری ہے کہ آخر ہم اپنے تئیں ان صحابہ کرام کے بارے میں کیا عقیدہ رکھیں، جنہوں نے یزید کے خلاف ''تغییر منکر'' کی مہم میں عملاً امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ساتھ نہیں دیا، تو اس امر کا فیصلہ خود عباسی کے معتمد مورخ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں نہایت وضاحت کے ساتھ کر دیا ہے، آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

"واما غير الحسين من الصحابة الذين كانوا بالحجاز و مع يزيد بالشام والعراق و من التابعين لهم فرأوا ان الخروج على يزيد وان كان فاسقا، لا يجوز لما ينشأ عنه من الهرج والدماء فاقصروا عن ذلك ولم يتابعوا الحسين و لا انكروا عليه و لا اثموه، لانه مجتهد وهو اسوة المجتهدين ولايذهب بك الغلط ان تقول بتأثيم هولاء بمخالفة الحسين و قعودهم عن نصره.... انه عن اجتهاد"(۱)

''لیکن امام حسین کے علاوہ بعض صحابہ وتابعین جو حجاز وشام اور عراق میں تھے، ان کی رائے یہ تھی کہ یزید اگرچہ فاسق ونااہل ہے، لیکن قتل وخونریزی کے باعث اس کے خلاف کسی طرح کا اقدام صحیح نہیں ہے۔ اسی وجہ سے عملاً انہوں نے امام حسین کا ساتھ نہیں دیا۔ امام حسین کے اقدام کے حق ہونے سے انہوں نے انکار نہیں کیا اور نہ انہوں نے

۱۔ مقدمہ ابن خلدون، ص: ۲۷۰

امام حسین کو خطا کار و گنہگار ٹھہرایا، کیونکہ وہ مجتہد ہیں اور مجتہد کی یہی شان ہوتی ہے۔ اس غلطی سے ہمیشہ بچنا کہ امام حسین کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے صحابہ کو گنہگار کہو، کیونکہ یہ بھی ان کا ایک اجتہاد تھا۔"

اس عبارت میں تین اشارات خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔

اولاً: یہ کہ تطہیر ملت کی اس عظیم الشان مہم میں بعض صحابہ کرام کی عدم شرکت کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ یزید کی امارت سے مطمئن تھے، بلکہ ان کی مصلحت یہ تھی کہ عزل امیر کے لیے جن وسائل غلبہ و طاقت کی ضرورت تھی، وہ اس وقت میسر نہیں تھے۔ بے سروسامانی کی حالت میں اس طرح کے اقدام سے سوائے اس کے کہ قتال و خونریزی ہو اور کوئی نتیجہ ان کی نگاہ میں متوقع نہیں تھا۔

ثانیاً: یہ کہ اگرچہ بعض صحابہ اس راہ میں عملاً امام حسین کی رفاقت سے دست کش رہے، لیکن کبھی بھی انہوں نے امام حسین کو غلط کار و گنہگار نہیں سمجھا اور نہ ہی ان کے اقدام پر کسی طرح انکار کیا۔

ثالثاً: یہ کہ صحابہ کرام اور امام حسین سب کے سب مجتہد تھے۔ صحابہ کی نگاہ اسباب ظاہری کے فقدان اور مصلحت کے تقاضوں پر تھی۔ وہ صحیح وقت کا انتظار کر رہے تھے اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نظریہ یہ تھا کہ تغیر منکر کی مہم میں ہمارا فرض کامیابی کی ضمانت نہیں ہے، باطل و منکر کے خلاف قدم اٹھا دینا ہی ادائیگی فرض کے لیے بہت کافی ہے۔ نتائج کا کفیل خدائے قدیر ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم صحیح کو صحیح کہہ دیں اور غلط کو غلط تا کہ خوب و ناخوب کا امتیاز مٹنے نہ پائے۔

غرض دونوں کی نگاہ دین کی مصلحت اور شریعت کے مفاد پر تھی۔ دونوں یزید کی نااہلیت پر متفق تھے۔ اختلاف صرف وقت کے تعین میں ہے اور چونکہ دونوں درجہ اجتہاد پر تھے، اس لیے ان میں سے ہر ایک کی فکر اپنے فیصلہ میں آزاد تھی۔ ضابطہ کے طور پر کوئی کسی کو اپنی رائے کا تابع نہیں بنا سکتا تھا۔ وما علینا الا البلاغ

حامیان یزید کی نقاب کشائی

کچھ عرصہ سے پاک و ہند میں ایسی تحریریں، کتابیں اور رسائل کی شکل میں پھیلائی جارہی ہیں، جن میں اہل بیت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، خاندان نبوت اور مدحت سرایان اہل بیت کے خلاف بے سروپا مواد جمع کرکے تاریخی تحقیق و تنقید کا منہ چڑانے کا کام لیا جارہا ہے۔

نظریاتی فتنوں کی ایک شکل تو صدیوں سے کام کررہی تھی، جس میں اہل بیت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے تمام افراد کو علیحدہ کرکے صرف پانچ نفوس قدسیہ کو مستحق عقیدت سمجھا جانے لگا۔ خاندان نبوت کے اکثر افراد کو مستثنیٰ قرار دے کر صرف چند حضرات کو ہی اس حلقہ میں رکھا گیا، پھر جب تک اہل بیت اور خاندان نبوت کے علیحدہ کردہ بزرگان ملت کو سب و شتم کا نشانہ نہیں بنالیا جاتا تھا، مدحت سرائی کے فریضہ سے سبکدوش تصور نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس دینی فتنے نے پوری اسلامی تاریخ پر اپنے منحوس اثرات مرتب کیے اور صحابہ کرام، امہات المومنین اور دیگر بزرگان دین پر بے پناہ الزامات گھڑے اور ہوس خبث باطن کی تسکین کی گئی۔ ایسے لٹریچر نے نیک لوگوں پر زبان درازی کی روایت قائم کی اور اسلامی دنیا میں گستاخانہ انداز تحریر کے دروازے کھول دیئے۔ اب اس رجحان کو جب

خارجی عناصر نے اپنے قلموں کی نوک پر رکھا تو وہ نوک سنان بن کر اہل ایمان کے جذبات کو مجروح کرتی گئیں۔ غالی شیعوں نے اپنی جارحانہ تقریروں سے ملت کے ان نیک دل قارئین کے جذبات کو پامال کرنے میں کبھی ندامت محسوس نہ کی تھی، جنہیں صحابۂ رسول سے محبت وعقیدت تھی۔ اب ان کی رسوائے عالم عادت کو خارجی اہل قلم نے اپنا لیا ہے اور وہ پاک و ہند میں اہل بیت، سادات کرام اور خصوصیت سے امام عالی مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ذات کو نشانہ ستم بنا کر کتابیں لکھتے جا رہے ہیں۔ وہ اپنے قارئین میں ایک غلط تاثر دے رہے ہیں کہ خاندان نبوت میں سے سید، بنو ہاشم اور امام حسین رضی اللہ عنہ کو اسلامی تاریخ میں کوئی ممتاز مقام حاصل نہیں رہا۔ ان کے ہاں اسلام کی تاریخ میں فاتحین، شمشیر زن اور بادشاہوں کو تو ایک درجہ حاصل ہے، مگر جس نے میدان کربلا میں حق و باطل کے معرکہ کو زندہ جاوید بنا دیا تھا، جس کی شمشیر پر دنیا کے تیغ زن فخر کرتے ہیں اور جس نے دنیا بھر کے بادشاہوں کو اصول حکمرانی سکھائے تھے، انہیں اتنا بھی حق نہیں دیا جا سکتا کہ ان کے کردار کو احترام وعقیدت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

اس سلسلہ میں محمود عباسی کی رسوائے عالم کتاب خلافت معاویہ و یزید، تحقیق سید وسادات، تحقیق مزید، پھر مولانا سلیمان کی سادات بنو امیہ اور یزید، محمد دین بٹ کی رشید بن رشید اور اس جیسی چھوٹی موٹی کتابوں نے ان پاکیزہ ہستیوں کے تقدس کو سخت مجروح کیا۔ علمائے اہل سنت نے ان ناپاک تحریروں کا بروقت اور سخت نوٹس لیا۔ ان قلم کاروں کی ناپاک کوششوں کی ہمیشہ مذمت کی۔ ہندوستان کے علمائے اہل سنت میں سے علامہ مشتاق احمد نظامی (مصنف 'خون کے آنسو') نے اپنے ماہنامہ پاسبان کا ۱۹۶۰ء میں خصوصی نمبر ترتیب دیا اور خارجیوں کے ناپاک عزائم کو بے نقاب کرنے میں ایک کامیاب کوشش کی۔ دسمبر ۱۹۶۸ء جام نور جمشید پور بہار نے ان نقاب پوش مورخین کو اپنے قلم کی انی سے بے نقاب کر دیا۔ اور پھر اس ذہن کے محرکات اور اسباب کو سامنے لا رکھا ہے، جو ان کے پیچھے کام کر رہا تھا اور ان سارے ذرائع کی نشاندہی کر دی، جو اپنے نظریات کے سایوں میں ایسی ناپاک تحریروں کو نشوونما دیتے رہے تھے۔

دراصل اس فکری رجحان کے پیچھے عقیدہ اور نظریہ کی پوری قوت کارفرما ہے، جس کے اسباب وعلل پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔

''خلافت معاویہ ویزید'' سے متعلق دیوبند کا جماعتی آرگن روزنامہ ''الجمعیۃ'' دہلی کے ایڈیٹر کا شذرہ غالباً آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ اس کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''ابھی حال میں پاکستان سے خلافت معاویہ ویزید پر ایک کتاب شائع کی گئی ہے، جو ہمارے نظر سے بھی گزری ہے اور جو اپنے موضوع پر اس قدر محققانہ اور مورخانہ ہے کہ اس سے بہتر ریسرچ کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔''(۱)

غور فرمائیے، کیا اب بھی دیوبندی جماعت کا مسلک وعقیدہ معلوم کرنے کے لیے مزید کسی رائے کا انتظار باقی ہے؟ اور کیا اس خوش فہمی کے لیے اب کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ ''خلافت معاویہ ویزید'' کی تائید وحمایت میں وہ پیش پیش نہیں ہیں؟

؎ نہ تھی دل میں تو کیوں آئی زباں پر

صوبہ بہار میں دیوبندی جماعت کی امارت شرعیہ پھلواری شریف کا آرگن پندرہ روزہ 'نقیب' خلاف معاویہ ویزید کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''علمائے دیوبند کی بدولت احادیث کی اشاعت نے بھی حقیقت پر سے پردہ اٹھایا۔ جناب محمود عباسی کی یہ کتاب ''خلافت معاویہ ویزید'' اسی احقاق حق کی آخری کوشش ہے۔''(۲)

شاباش! جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ آپ ہی کہیے، اب اس میں کیا شبہ رہ جاتا ہے کہ اس طرح کے احقاق حق کی آخری کوشش نہ سہی، اولین کوشش تو علمائے دیوبند کی طرف ضرور ہی منسوب ہے، کیوں کہ انہوں نے بنیاد رکھی، عباسی نے ایوان کھڑا کیا۔

اول با آخر نسبتے دارد۔

۱۔ الجمعیۃ، ۲۰؍اکتوبر ۱۹۵۹ء

۲۔ نقیب، ۹؍اکتوبر ۱۹۵۹ء

چند سطروں کے بعد پھر ''نقیب'' لکھتا ہے۔

''بیشک ہم امام حسین کی فضیلت کے قائل ہیں، اس لیے کہ وہ مسلمان تھے، تابعی تھے اور بعض دلائل کی بنا پر صحابی تھے اور جس بات کو حق سمجھا، گو اس میں اجتہاد کی غلطی ہوئی، اس بات کے لیے مردانہ وار جان دے دی۔''(۱)

اس سے بڑھ کر فضیلت کا اعتراف اور کیا ہوسکتا ہے کہ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ''مسلمان'' تھے۔ باقی رہا ان کا ''صحابی'' ہونا تو یہ متفقہ طور پر ثابت نہیں ہے۔

واللہ........حد ہوگئی کور چشمی اور عناد کی بھی!

امام کے متعلق جس طبقہ کے خیالات اس قدر جارحانہ ہیں، کیا اب بھی ان کا مسلک وعقیدہ معلوم کرنے کے لیے مزید کسی رائے کا انتظار باقی ہے اور کیا اس خوش فہمی کے لیے اب کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ ''خلافت معاویہ و یزید'' کی تائید میں ان کے قلم سے اتفاقاً لغزش ہوگئی ہوگی!

؎ نہ تھی دل میں تو کیوں آئی زباں پر

بہت کم لوگوں کا ذہن اس طرف گیا ہوگا کہ ''خلافت معاویہ و یزید'' جیسی دلآزار کتاب کی طباعت واشاعت میں در پردہ کن لوگوں کا ہاتھ ہے؟ حیرت زدہ ہو کر سنیے کہ وہ دیوبندی جماعت کے ایک مایہ ناز اہل قلم اور معتمد عالم ہیں۔ دوسروں کی روایت نہیں، خود عباسی نے اپنے دیباچہ میں ان لوگوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ ملاحظہ ہو، عباسی لکھتا ہے:

''محبی و محترمی جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی، مدیر صدق جدید نے اپنے مکتوب مرقومہ ۱۰ر فروری، موسومہ مدیر رسالہ 'تذکرہ' میں فرمایا تھا کہ آپ کے 'الحسین' پر تبصرہ کے عنوان سے جو مسلسل مقالہ نکل رہا ہے، وہ بہت ہی جامع، نافع، بصیرت افروز ہے۔ اسے کتابی شکل میں لایئے۔''(۲)

۱۔ نقیب، ۹ر اکتوبر ۱۹۵۹ء

۲۔ دیباچہ خلافت معاویہ و یزید، ص: ۱۳

''صدیق جدید'' کے ایڈیٹر عبدالماجد دریابادی ہمارے لیے کچھ اجنبی نہیں ہیں۔ یہ شیخ دیوبندی مولوی حسین احمد مدنی آنجہانی کے جانے پہچانے مرید اور رئیس الطائفہ مولوی اشرف علی تھانوی کے مجاز معتمد اور خلیفہ ہیں۔ یہی حضرت ہیں، جنھوں نے تھانوی صاحب کی منقبت میں ''حکیم الامت'' نام کی ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کی تربیت وصحبت میں اپنے مزاج کی تبدیلی کا حال ایک جگہ وہ خود اپنی اسی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''ایک زمانہ تھا کہ بزرگوں کے کرامات اور کمالات اور ان کے مناقب کے کلام سے بڑی دلچسپی تھی اور توحیدی مضامین خشک و بے مزہ معلوم ہوتے تھے۔ ایک عرصے سے صورت حال بالکل برعکس ہے۔ اب توحید ہی کے مضامین سننے اور پڑھنے کو دل چاہتا ہے اور بڑے سے بڑے بزرگ کے لیے ان کی بشریت کا تصور اتنا غالب آجاتا ہے کہ ان کے کرامات ومناقب میں اب زیادہ جی نہیں لگتا۔ حد یہ ہے کہ نعتیہ کلام میں بھی اب اگلی سی دل بستگی باقی نہیں۔''(۱)

تھانوی صاحب کی صحبت میں محبوبان الٰہی ومقربان حق سے بے تعلقی و بیگانگی کا یہ جذبہ بیزاری تنقیص کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ چنانچہ یہی عبدالماجد دریابادی کا گستاخ قلم ایک جگہ صحابہ کرام پر طعن کرتا ہے۔ یقین نہیں آتا تو دل پر جبر کر کے کسی طرح اسے پڑھیے اور سینہ پیٹیے کہ آپ کی آبادی میں کیسے کیسے جراح پیدا ہو چکے ہیں؟

> ''جب حضرات صحابہ تک نہ عملی معصیتوں سے محفوظ رہے، نہ اجتہادی لغزشوں سے تو دوسرے حضرات کا مرتبہ تو ان سے فروتر ہے۔''(۲)

سن لیا آپ نے؟ یہ ہیں دیوبندی تربیت گاہ کے سند یافتہ عارف، جن کی نگاہ میں معاذ اللہ صحابہ تک گنہگار ہیں۔ وہ آج اگر امام حسین اور اہل بیت رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی

۱۔ حکیم الامت، ص: ۵۸۳

۲۔ نفس مصدر، ص: ۲۰۶

مذمت وتنقیص کیا، دشمن کو خراج تحسین پیش کررہے ہیں، تو اس میں تعجب وشکوہ ہی کیا ہے، جبکہ صحابہ کرام کی حرمت خود ان کے ہاتھ سے گھائل ہے اور یہ سارا زہر تو اسی میکدہ کا ہے، جس کے کلید بردار جناب تھانوی صاحب ہیں۔ دیوبندی تربیت گاہوں میں جب اس طرح کا زہر کشید کیا جاتا ہے تو آپ ہی غور فرمائیے کہ اس جماعت کے معتمد عبدالماجد دریابادی کی تحریک پر جو کتاب طبع ہو کر شائع ہوئی، وہ دلآزار گستاخیوں پر مشتمل ہے، تو حیرت کیسی۔ کیا اب بھی ان کا مسلک وعقیدہ معلوم کرنے کے لیے کسی رائے کا مزید انتظار باقی ہے؟

اور کیا اس خوش فہمی کے لیے کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ ''خلافت معاویہ ویزید'' کی تائید میں ان کے قلم سے لغزش ہوگئی ہوگی؟

؎ نہ تھی دل میں تو کیوں آئی زبان پر

یہ معلوم کرکے آپ حیرت میں ڈوب جائیں گے کہ قاتل حسین، یزید کی عظمت و فضیلت اور صداقت و بے گناہی ثابت کرنے کے لیے عباسی نے اپنی کتاب میں حامیان یزید کی جو شہادتیں پیش کی ہیں، ان میں یورپ کے ناخداترس ملحدین اور اسلام دشمن مورخین کے علاوہ دیوبندی جماعت کے شیخ المشائخ مولوی حسین احمد آنجہانی کا نام نامی بھی ہے۔ گویا دشمن کے ہاتھ میں جو تلوار چمک رہی ہے، وہ آپ ہی کی عطا کردہ ہے۔

؎ قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

عباسی کا پیش کردہ حوالہ ملاحظہ فرمائیے:

حضرت مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمۃ اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:

''تاریخ شاہد ہے کہ معارک عظمیہ میں یزید نے کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ خود یزید کے متعلق بھی تاریخی روایات، مبالغہ اور آپس کے تخالف سے خالی نہیں۔''(۱)

ملاحظہ فرمائیے یہ ہیں یزید کی طرف سے صفائی کے گواہ شیخ دیوبند..... ذرا متذکرہ جملے پھر غور سے پڑھیے گا۔

۱۔ مکتوبات، جلد: اول، ص: ۲۵۲،۲۴۲، خلافت معاویہ ویزید، ص: ۳۰

خود یزید کے متعلق بھی تاریخی روایات میں شہادت امام حسین بھی ہے اور معرکہ کربلا کے دردناک مظالم بھی۔ مخدرات اہل بیت کی اسیری و بے پردگی بھی ہے اور خانہ کعبہ کی بے حرمتی و اہل مدینہ کا قتل عام بھی۔ قصہ مے نوشی و سرود و نغمہ، ترک فرائض اور اشاعت منکرات، سبھی کچھ تاریخی روایات میں ہیں، لیکن مصلحت بالائے طاق رکھ کر اگر اس کی بھی نشاندہی کی گئی ہوتی کہ ان تاریخی روایات میں مبالغہ اور تخالف کہاں کہاں ہے، تو آج محمود عباسی تشریح کی زحمت سے بچ جاتے۔

ویسے اس سے زیادہ اور اس کمبخت کا قصور ہی کیا ہے کہ اس نے اسی اجمال کی تفصیل اور اسی متن کی شرح کا نام ''خلافت معاویہ و یزید'' رکھ دیا

حرم کی خاک پہ لات و منات کیا کم ہیں
یہ کیا ضرور کسی برہمن کی بات کریں

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اجمال و تفصیل اور متن و شرح دونوں جگہ قلم کے پیچھے ایک ہی ارادہ، ایک ہی مطمح نظر اور ایک ہی محرک کارفرما ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عباسی کا قلم اپنی ناعاقبت اندیش گستاخی کا شکار ہو کر برہنہ ہو گیا ہے اور شیخ دیوبند اپنی مصلحت اندیش چالاکی سے بے نقاب نہیں ہو سکے، لیکن ؎

نزدیک ہیں وہ دن کہ پس پردۂ جلوہ
پابندی آداب تماشہ نہ رہے گی

اب آپ ہی غور فرمائیے۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی دیوبندی جماعت کا مسلک و عقیدہ معلوم کرنے کے لیے اب مزید کسی رائے کا انتظار باقی ہے؟

اور کیا اس خوش فہمی کے لیے اب کوئی گنجائش رہ گئی ہے کہ ''خلافت معاویہ و یزید'' ان کے جماعتی عقیدہ کی ترجمان نہیں ہے!

؎ نہ تھی دل میں تو کیوں آئی زباں پر

ایک نیا انکشاف ملاحظہ فرمایئے اور خدا کا شکر ادا کیجیے کہ اس کی مخفی تدبیر مجرمین کے چہرے سے کتنے حیرت انگیز طریقہ پر نقاب کشائی فرماتی ہے۔

عباسی نے اپنی کتاب ''خلافت معاویہ و یزید'' میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور امام عالی مقام رضی اللہ تعالی عنہ کی تقصیر و خطا اور یزید کی طہارت و بے گناہی ثابت کرنے کے لیے جونشانے قائم کئے ہیں، وہ دور حاضر کے ملحدین کی زبان میں ان کے ذہن وفکر کی کوئی نئی تخلیق نہیں ہے۔ آج سے پانچ سال پہلے اس کی بنیاد دیوبندی جماعت کے مشہور مناظر اور ان کی تبلیغی جماعت کے موجودہ سربراہ مولوی منظور عثمانی کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ ''الفرقان''، لکھنؤ کے صفحات پر پڑ چکی ہے۔ حوالہ کے لیے ماہنامہ ''الفرقان'' اگست ۵۴ ۱۹۵۴ء صفحہ ۱۹ او ۴۰ اور ''الفرقان'' ستمبر ۵۴ ۱۹۵۴ء، ص ۷ ۴۷ کے مضامین کا خلاصہ ذیل میں ملاحظہ فرمایئے:

ا۔ اہل بیت کے سلسلہ میں مسلمان افراط وتفریط میں مبتلا ہو گئے ہیں اور اعتقاد وعمل میں غلو سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ ہزاروں بے بنیاد روایات اہل بیت اور واقعہ کربلا کو اہمیت دینے کی غرض سے گھڑلی گئی ہیں۔

ب۔ امام حسین محض اپنی ذاتی عزت کے سوال پر شہید ہوئے۔

ج۔ امام حسین کا خیال غلط اور باطل تھا۔

د۔ یزید کے خلاف امام حسین کا اقدام بغاوت وخروج تھا۔

ہ۔ صحابہ کرام نے یزید کی بیعت سے انکار کیا۔ یہ ان کا شخصی اجتہاد تھا۔

ٹھیک اس کے ایک سال بعد نومبر ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ کے مشہور ادبی ماہنامہ ''نگار'' میں ''الفرقان'' کے مذکورہ بالا مضمون پر ''واقعہ کربلا'' کے عنوان سے کسی سنی اہل قلم کی ایک تنقید شائع ہوئی تھی۔

اس کی ابتدائی سطریں ملاحظہ فرمایئے اور تأثرات کی یکسانیت کا تماشا دیکھیے۔

''مضمون بالاستیعاب پڑھنے کے بعد میں اور کئی ذی علم دوست اس نتیجہ پر پہنچے کہ مضمون نگار اول سے آخر تک حکومت بنی امیہ اور خصوصاً

یزید کی پوزیشن صاف کرنے اور امام عالی مقام سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مظلومانہ حیثیت اور اولوالعزمانہ شہادت کا مرتبہ گھٹانے میں ساعی رہے ہیں۔ اس لیے اگر ان کے مضمون کو حمایت یزید (Apology For Yazid) کے نام سے موسوم کیا جائے تو بے جا نہیں۔ مضمون کے پہلے نمبر کو پڑھ کر بعض صاحبوں نے ان پر اعتراضات کیے تھے کہ حضرت امام حسین کے اقدام کے لیے بغاوت کا لفظ کیوں استعمال کیا؟ نیز حضرت کا بیعت یزید کے لیے آمادہ ہو جانا، صحابہ کا یزید سے بیعت کر لینا اور یزید کا حادثہ کربلا پر رنج کرنا، کس بنا پر لکھ دیا؟ ان اعتراضات کے جو جوابات انہوں نے دیے ہیں، ان میں سے ہر شخص یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگا کہ وہ اموی سلطنت کے طرفداروں میں ہیں۔"(۱)

غور فرمایئے، حضرت امام حسین و اہل بیت رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے متعلق ان کا جارحانہ عقیدہ جسے سلف سے لے کر خلف تک سب نے اپنا مذہبی شعار بنالیا ہے، واضح طور پر معلوم ہو جانے کے بعد بھی کیا متذکرہ حوالے سے ان کا اعتقادی موقف معلوم کرنے کے لیے اب مزید کسی رائے کا انتظار باقی ہے اور پھر کیا اس خوش فہمی کے لیے اب بھی کوئی گنجائش رہ گئی ہے کہ "خلافت معاویہ و یزید" ان کی جماعتی عقیدہ کی ترجمان نہیں ہے؟

اس حقیقت سے غالباً آپ بھی اختلاف نہیں کریں گے کہ حالات کے دباؤ سے رائے عامہ کی تائید کو مسلک وعقیدہ نہیں کہا جا سکتا، البتہ وقت کے تقاضوں کے مطابق اسے عاقبت اندیش اقدام کہنا صورت حال کی صحیح تعبیر ہو سکتی ہے۔

مثال کے طور پر حکومت دہلی اور ریاست بنگال کے جن غیر مسلم سربراہوں نے کتاب "خلافت معاویہ و یزید" کو ضبط کر کے نفرت اور مذمت کا اظہار کیا ہے۔ ان کے متعلق یہ کہنا فاش غلطی ہے کہ یہی ان کا عقیدہ و مسلک بھی ہے۔

۱۔ ماہنامہ نگار، ص ۷۹، نومبر ۱۹۵۵ء

اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ جو صحیح بات کہی جاسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے کتاب کو ضبط کر کے رائے عامہ کے جذبات کا احترام کیا ہے۔

اس کے بعد کی ایک عبارت اور ملاحظہ فرمایئے۔

تنقید نگار لکھتا ہے:

"انہوں نے اپنے نزدیک امام پر بڑا احسان کرتے ہوئے آپ کی شہادت کو تسلیم کرلیا ہے، مگر اس کو محض ذاتی عزت کا سوال قرار دیا ہے۔ حالانکہ دوسری جگہ خود ان کے خیال کو باطل ٹھہرایا ہے۔ اب کہیے کس کو صحیح مانا جائے۔"(۱)

اخیر کی ایک عبارت اور ملاحظہ فرمایئے:

"انہوں نے اپنے مضمون میں نہایت جسارت سے حضرت کے اقدام کے متعلق "بغاوت" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور جب کسی شخص نے روکا تو صاف صاف اظہار ندامت کے بجائے تاویل رکیک کی آڑلی ہے۔"(۲)

اب آپ اپنا حافظہ ذرا تازہ کر لیجیے اور عباسی کی "خلافت معاویہ ویزید" اور تبلیغی جماعت کے آرگن "الفرقان" لکھنؤ بابت ماہ اگست دسمبر ۱۹۵۵ء کے مضامین واقتباسات پر ایک منصفانہ نظر ڈال کر فیصلہ کیجیے کہ یزید کی طہارت و بے گناہی اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی تقصیر وخطا ثابت کرنے کے لیے عباسی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، کیا یہ وہی خیالات نہیں ہیں، جنہیں آج سے پانچ سال پیشتر دیوبندی جماعت کے ایک ذمہ دار حلقہ نے شائع کیا تھا۔ یہاں تک کہ "الفرقان" کے یہ مضامین پڑھنے کے بعد غم وغصہ کے یہی تأثرات اس وقت بھی ذہن میں پیدا ہوئے تھے، جو آج "خلافت معاویہ ویزید" کے مطالعہ سے عام اذہان میں پیدا ہورہے ہیں۔

۱۔ نگار، ص ۲۱، ماہ دسمبر ۱۹۵۵ء

۲۔ نفس مصدر

تجربات وتاثرات کی شہادت کے بعد اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ دونوں تحریروں میں ایک ہی تخیل، ایک ہی طرز استدلال، ایک ہی انداز بیان، ایک ہی لب و لہجہ اجمال وتفصیل کے ساتھ مشترک ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ''الفرقان'' کی شقاوت کا احساس اس وقت ایک خالص حلقہ میں محدود ہو کر رہ گیا تھا اور آج عباسی کا فسانہ بد بخت نگر نگر میں پھیل گیا ہے۔

اب میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یزید کی حمایت میں دیوبند جماعت کے تبلیغی آرگن ''الفرقان'' کی گرم جوش سبقت اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف جارحانہ شہادت کے بعد بھی کیا اس باب میں دیوبندی جماعت کا مسلک وعقیدہ معلوم کرنے کے لیے اب مزید کسی رائے کا انتظار باقی ہے اور پھر کیا اس خوش فہمی کے لیے اب بھی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ ''خلافت معاویہ ویزید'' ان کے جماعتی مسلک واعتقاد کی ترجمان نہیں ہے؟

؎ نہ تھی دل میں تو کیوں آئی زباں پر

دیوبندی جماعت کی طرف سے یزید کی حمایت اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف جارحانہ خیالات کا قصہ اتنے پر ختم نہیں ہوتا، بلکہ اس جذبہ میں وہ اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہوں نے امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اقدام سے بیزاری وناراضگی کا رشتہ نبی محترم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ الامان والحفیظ

ملاحظہ فرمایئے اخبار ''النجم'' لکھنؤ، جس کے ایڈیٹر دیوبندی جماعت کے امام مولوی عبدالشکور کاکوروی ہیں۔ ۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۶ھ کو ایک کربلا نمبر شائع ہوا تھا۔ اس میں مضمون نگار باغیان خلافت کے خلاف وعید عذاب اور عقوبت وسزا والی حدیثوں کو بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے:

''بقیہ تمام روایتوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی طرح یزید کی مخالفت پر رضامند نہ تھے۔''(۱)

۱۔ النجم، ۱۰ محرم ۱۳۵۶ ہجری، لکھنؤ، ص: ۲۵

معاذ اللہ! یزید کی حمایت میں ذرا اس تحرف وافتراء پردازی کی ناپاک جسارت ملاحظہ فرمائیے۔ اس مفتری وکذاب کا مقصد یہ ہے کہ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یزید کی مخالفت کر کے اپنے نانا جان سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ناراض کر دیا۔

ذرا غور فرمائیے، امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قلب نازک پر اس سے بھی زیادہ دردناک اذیت کی کوئی چوٹ لگائی جا سکتی ہے؟ نعوذ باللہ من شرور انفسھم.

آگے چل کر مضمون نگار نے چند وہ حدیثیں نقل کی ہیں، جن کا مفاد یہ ہے کہ جب بندوں میں اللہ کی نافرمانی بڑھ جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ بادشاہوں کے دلوں کو قہر وغضب اور سخت گیری کے ساتھ ان کی طرف پھیر دیتا ہے اور وہ انہیں طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کرتا رہتا ہے۔

ان حدیثوں کے بیان کرنے کے بعد نتیجہ کے طور پر اخیر میں لکھا ہے:

"یزید کو جو اس وقت کے مسلمانوں پر ایک عذاب الٰہی کا نمونہ تھا، ہرگز ہرگز برا کہنے کی اجازت نہیں......"(۱)

اس عبارت سے نامراد کی مراد یہ ہے کہ معاذ اللہ اس وقت صحابہ کرام اور اہل بیت میں خدا کی نافرمانی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ خدا نے ان کی تعزیر وعقاب کے لیے یزید کو ان پر مسلط کر دیا تھا۔

ایمان وعقیدت کے اسپرٹ غور فرمائیے۔ یہ ہیں دیوبندی جماعت کے وہ جارحانہ افکار وخیالات، جن کے آگے عباسی کی شقاوت بھی ہاتھ باندھے کھڑی ہے......اور یہ جملہ تو اشک بار آنکھوں سے بار بار پڑھنے کا ہے:

"یزید کو ہرگز ہرگز برا کہنے کی اجازت نہیں۔"

بے لاگ ہو کر اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ اتنا سب کچھ منظر عام پر آ جانے کے بعد، کیا اس بات میں دیوبندی جماعت کا مسلک وعقیدہ معلوم کرنے کے لیے اب بھی کوئی گنجائش رہ گئی ہے کہ "خلافت معاویہ ویزید" ان کے جماعتی مسلک واعتقاد کی ترجمان نہیں؟

ع نہ تھی دل میں تو کیوں آئی زباں پر

۱۔ النجم، ص:۲۶

شہید کربلا، شہزادہ گلگوں قبا، سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق دیوبندی جماعت کے یہ جارحانہ خیالات کچھ نئے نہیں ہیں۔ ان کے مذہبی اکابر واصاغر نے اپنی تصنیفات میں نہایت ہی شدومد کے ساتھ اپنے متبعین کو امام عالی مقام کی بارگاہ اطہر میں خراج ثواب ونذر عقیدت تک پیش کرنے سے منع کیا ہے۔

جذبہ شقاوت کی انتہا یہ ہے کہ یہ لوگ عشرۂ محرم میں امام عالی مقام کی سرگزشت تسلیم ورضا اور تذکرۂ واقعات کربلا کا زبان پر لانا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ حوالہ کے لیے دیکھیے، دیوبندی جماعت کے امام اعظم مولوی رشید احمد گنگوہی کی فتاویٰ رشیدیہ۔ ۱

خالی الذہن ہو کر غور کرنے کے بعد اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ یا تو یہ لوگ امام عالی مقام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عظیم المرتبت شہادت کو شہادت ہی نہیں سمجھتے، بلکہ خروج وبغاوت کی شرعی تعزیر گردانتے ہیں، یا پھر یزید کے جذبہ حمایت میں یہ اتنا بھی برداشت نہیں کرسکتے کہ امام واجب الاحترام کی دردناک مظلومی اور رقت انگیز واقعہ شہادت کا اظہار کر کے یزید کے مظالم وشقاوت کی داستان منظر عام پر لائی جائے۔

بہرحال جو وجہ بھی ہو، اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ان لوگوں نے اپنے اس جذبے کی شدت میں اتنا غلو کرلیا ہے کہ اب یہ ان کا مذہبی عقیدہ بن چکا ہے، جس پر یہ مسلح ہو کر خانہ جنگی تو کرسکتے ہیں، لیکن رجوع نہیں کرسکتے۔

ٹھیک یہی صورت حال قاری طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی ہے۔ جب دیوبند کے کتب فروشوں نے، جو عقیدۃً بھی دیوبندی ہیں، کتاب کی اشاعت میں حصہ دار بن کر مارکیٹ تک اسے پہنچایا، تو اس وقت یہ خاموش تھے۔ جب دیوبند کے ماہناموں ''تجلی'' اور ''اسلامی دنیا'' نے اس کی تائید میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے، تو اس وقت بھی یہ خاموش رہے۔ جب دیوبندی جماعت کے آرگن ''الجمعیۃ'' دہلی نے کتاب کی حمایت میں اپنا گمراہ کن تبصرہ شائع کیا تو اس وقت بھی خاموش رہے۔

۱۔ موصوف لکھتے ہیں: ''محرم میں ذکر شہادت حسنین علیہما السلام کرنا، اگرچہ بروایت صحیحہ ہو، سبیل لگانا، شربت پلانا، چندہ سبیل اور شربت میں دینا، یا دودھ پلانا، سب نادرست اور تشبہ روافض کی وجہ سے حرام ہے۔ فتاویٰ رشیدیہ، ص: ۱۳۹

غرض دارالعلوم کے پس دیوار سے لے کر لکھنؤ تک، شہید کربلا کے خلاف جارحانہ نعرے بلند ہوتے رہے اوران کے قلم کو جنبش تک نہ ہوئی اور نہ ہی ان کے عقیدے کو ٹھیس لگی، بلکہ پورے سکون قلب کے ساتھ یہ آل رسول کی بے حرمتی کا تماشہ دیکھتے رہے۔

لیکن کتاب کی اشاعت میں دیوبند کے کتب فروشوں، دیوبند کے ماہناموں، تبلیغی جماعت کے آرگن ''الفرقان'' اور روزنامہ ''الجمعیۃ'' کی سرگرمیوں کے نتیجے میں جب رائے عامہ دیوبندی مکتبہ خیال کے حق میں مشتعل ہونے لگی، تو دارالعلوم دیوبند کے مہتمم صاحب کو اپنے ارادے کا مفاد خطرے میں نظر آیا اور فوراً انہوں نے اپنے عقیدہ ومسلک کی صفائی میں ایک قرارداد منظور کر کے ملک میں شائع کر دیا۔ قرارداد کی عبارت پڑھنے کے بعد ہر شخص یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگا کہ اس کے پس منظر میں حمایت حق کی بجائے، اپنی صفائی کا جذبہ واضح طور پر کارفرما ہے۔

قرارداد کا یہ حصہ غور سے پڑھیے، جو ۴ر نومبر ۱۹۵۹ء کو دارالعلوم دیوبند کے ایک جلسہ میں منظور کی گئی۔

> ''دارالعلوم دیوبند کا یہ شاندار اجلاس، جہاں اس کتاب سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہے، وہیں ان مفتریوں کے خلاف بھی نفرت وبیزاری کا اعلان کرتا ہے، جنہوں نے اپنی کذب بیانی سے اس کتاب کی تصنیف واشاعت میں علمائے دیوبند کا ہاتھ دکھلا کر اور اسے علمائے دیوبند کی تصنیف باور کرانے کی سعی کر کے انتہائی دیدہ دلیری سے ''دروغ گویم بر روئے تو'' کا ثبوت دیا ہے اور اس حیلہ سے علمائے دیوبند کی پوزیشن کو مجروح کرنے کی ناپاک سعی کی ہے۔''(۱)

اگر واقعی کتاب کی طباعت واشاعت میں علمائے دیوبند کا ہاتھ نہیں ہے اور فی الحقیقت وہ اسے اپنے مسلک وعقیدہ کے خلاف سمجھتے ہیں، تو حق کی حمیت کے نام پر قاری طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ''اسباب جرم کی فراہمی اور اس

۱۔ پیام مشرق ۲۱ر نومبر ۱۹۵۹ء دہلی

کی تائید بھی جرم ہے'' کے اصول پر لگے ہاتھوں تھانوی صاحب کے خلیفہ مولوی عبدالماجد دریابادی، مکتوبات مولوی حسین احمد صدر دیوبند، النجم لکھنؤ، نقیب پھلواری شریف پٹنہ، الفرقان لکھنؤ، الجمعیۃ دہلی، فتاویٰ رشیدیہ، ماہنامہ تجلی اور اسلامی دنیا دیوبند، کے خلاف بھی اسی طرح اپنی نفرت و بیزاری اور غم و غصہ کی ایک قرارداد منظور کر کے ملک میں شائع کرادیں۔ کیونکہ ان میں سے بعض نے کتاب کی ترتیب و تدوین، مواد کی فراہمی طباعت، اشاعت، تائید میں بعنوان مختلف حصہ لیا ہے اور بعضوں نے اس طرح کے جارحانہ خیالات اپنی تحریروں میں پیش کیے ہیں، جیسا کہ ان کی تفصیلات گزشتہ اوراق میں سپرد قلم کر چکا ہوں۔

اگر مہتمم صاحب ایسا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکیں گے، تو انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ زیادہ دنوں تک وہ عوام کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔ کتاب سے بیزاری کے نتیجہ میں یہ لازمی مطالبہ پورا نہ ہوا، تو عوام یہ فیصلہ کرنے میں قطعاً حق بجانب ہوں گے کہ قرارداد کا مقصد ''حمایت حق'' نہیں ہے، بلکہ محض دارالعلوم دیوبند کے مالی مفاد کی خاطر عوام کی توجہات کو ٹوٹنے سے بچانا ہے، جیسا کہ پڑوس میں رہنے والے ایک واقف کار دیوبندی فاضل نے خود اس کی شہادت دی ہے۔

الفضل ماشهدت به الاعداء.

''ظاہر ہے کہ جس ادارے کا مدار ہی قوم کے چندے پر ہو، اسے حکمت و مصلحت کی نوک پلک درست رکھنی ہی چاہیے۔'' (۱)

یہی نہیں، دارالعلوم دیوبند کے مزاج شناس حلقوں کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ آج رائے عامہ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حمایت میں ہے، اس لیے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ یزید کے حامیوں کی مذمت میں قرارداد شائع کی جائے۔ کل اگر خدانخواستہ رائے عامہ یزید کی حمایت میں پلٹ جائے، تو دارالعلوم کے ارباب حل و عقیدہ کے لیے قطعاً کوئی امر مانع نہ ہوگا کہ وہ اسی لب و لہجہ کے ساتھ حامیان حسین کی مذمت میں قرارداد منظور کرلیں۔ حوالے کے لیے ذیل کا اقتباس پڑھیے:

۱۔ ماہنامہ تجلی دیوبند، دسمبر ۱۹۵۶ء صفحہ ۹

"وہ، مہتمم دارالعلوم دیوبند نہایت ضابط و متحمل ہیں۔ انہیں جذبات پر حیرت انگیز حد تک قابو ہے۔ وہ جب چاہیں، جس موضوع پر چاہیں، ایک ہی لب ولہجہ میں بات کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ کل اگر مصالح کا تقاضا یہ ہو کہ اس قرارداد کے بالکل برعکس تجویز پاس کی جائے، تو ان کا قابو یافتہ قلم اسے بھی نہایت اطمینان سے اسی خوشگوار لب ولہجہ میں ثبت قرطاس کر دے گا۔"(۱)

شاباش...... اسلام میں جس خصلت کو منافقت سے تعبیر کیا گیا ہے، اسے دیوبندی فاضل اپنے مہتمم صاحب کے محاسن میں شمار کر رہے ہیں۔

؎ خیال کن ز گلستان من بہار مرا

ویسے بھی ان حضرات کے یہاں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے مفاد اور جماعت کی مصلحت پر وہ اپنے مسلک وعقیدہ کا خون کرنے کے عادی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ فریب خوردہ عوام کے دلوں پر اپنا قبضہ باقی رکھنے کے لیے منہ بولا شرک وبدعت تک وہ خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔

ویسے عام حالات میں تو وہ مومنین کے آقا سید کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فضائل وکمالات کے اعتراف میں اپنا دل صاف نہیں رکھتے، لیکن جب کبھی جماعت کی مصلحت داعی ہوتی ہے، تو ان کی توصیف وثنا کے لیے اپنے دل پر جبر بھی کر لیتے ہیں۔

چھوٹوں کی نہیں، ان کے بڑوں کی باتیں کر رہا ہوں۔ "اشرف السوانح" کے مؤلف، دارالعلوم دیوبند کے ایک جلسہ دستار بندی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے پیر مغاں مولوی اشرف علی تھانوی کے متعلق لکھتے ہیں:

"دارالعلوم دیوبند کے بڑے جلسہ دستار بندی میں بعض حضرات اکابر نے ارشاد فرمایا کہ اپنی جماعت کی مصلحت کے لیے حضور سرور عالم

۱۔ ماہنامہ تجلی، دسمبر ۵۹، ص ۹، دیوبند

صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کیے جائیں، تاکہ اپنے مجمع پر وہابیت کا شبہ ہے، وہ دور ہو۔ یہ موقع ابھی اچھا ہے، کیونکہ اس وقت مختلف طبقات کے لوگ موجود ہیں۔ حضرت والا (تھانوی) سے باادب عرض کیا کہ اس کے لیے روایات کی ضرورت ہے اور وہ روایات مجھ کو مستحضر ہیں۔"(۱)

"ذرا اپنی جماعت کی مصلحت کے لیے" کا فقرہ ذہن پر زور دے کر پڑھیے اور سوچیے کہ یہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے ہمارے ساتھ کتنا سنگین مذاق کر رہے ہیں۔ بیچارہ عباسی تو بے نقاب ہو کر منظر عام پر آیا اور پٹ گیا۔ ہند و پاک کی کئی کروڑ مسلم آبادی اس کے منہ پر تھوک چکی ہے، لیکن دیوبندی کے یہ بازی گر جو اپنے چہروں پر خوبصورت نقاب ڈالے مسلم آبادیوں میں پھر رہے ہیں، کوئی انہیں کیوں نہیں چوراہے پر کھڑا کر دیتا، کیوں نہیں؟

رسول اور آل رسول کی حرمت پر مر مٹنے والے اگر شخصیت سے مرعوب نہیں ہیں، تو ان کا گریبان کیوں نہیں تھامتے؟

ایک طرف یزید کے حامیوں سے ان کے ساز باز ہیں دوسری طرف امام حسین رضی اللہ عنہ کے نیاز مندوں میں بیٹھ کر یہ آنسو بہاتے ہیں...... ایک طرف یہ صحابہ و اہل بیت کے مزارات مسمار کر دینے پر صحرائے نجد کے درندوں کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف درگاہوں کی مجاوری کے لیے ہر جگہ سازشوں کا جال بچھاتے پھرتے ہیں۔

آخر مکر و فریب کی یہ تجارت کب تک نفع بخش رہے گی اور پس پردہ منافقت کا یہ کھیل کب تک کھیلا جاتا رہے گا؟

برصغیر ہند کی ساڑھے سترہ کروڑ مسلم آبادی میں ہے کوئی بے لاگ صاحب نظر، جو ان کے نقاب کا دامن چاک کر کے انہیں بے پردہ کر دے؟

شدت غم سے چھلک آئے ہیں آنسو ورنہ
مدعا میرا نہیں آپ سے شکوہ کرنا

۱۔ اشرف السوانح، جلد:۱، ص ۷۶

دو شہزادے

افسردہ چہرے، بکھرے ہوئے بال اور بوسیدہ پیراہن میں نور کی دو مورتیں ایک مسلمان رئیس کے دروازے پر کھڑی تھیں۔

گردشِ ایام کے ہاتھوں ستائے ہوئے یہ دو کمسن بچے تھے۔ غیرت حیا سے آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اظہارِ مدعا کے لیے زَبان نہیں کھل رہی تھی۔

بڑی مشکل سے بڑے بھائی نے یہ الفاظ ادا کیے:

کربلا کے مقتل سے خاندانِ رسالت کا جو لٹا ہوا قافلہ مدینے کو واپس ہوا تھا، ہم دونوں بھائی اُسی قافلے کی نسل سے ہیں۔ وقت کی بات ہے کہ بچپن ہی میں ہم دونوں یتیم ہو گئے۔ قسمت نے دردر کی ٹھوکر کھلائی۔ کئی دن ہوئے کہ ایک قافلے کے ساتھ بھٹک کر ہم اس شہر میں آ گئے۔ نہ کہیں سر چھپانے کی جگہ ہے، نہ رات بسر کرنے کا ٹھکانہ، تین دنوں کے فاقوں نے جگر کا خون تک جلا ڈالا ہے۔ خاندانی غیرت کسی کے آگے زبان نہیں کھولنے دیتی۔ اب تکلیف ضبط سے باہر ہو گئی ہے۔

جس ہاشمی رسول کا خون ہماری رگوں میں موجزن ہے ان کے تعلق سے ہمارے حال زار پر تمھیں رحم آ جائے، تو ہمیں کچھ سہارا دے دو۔

آج تمہارے لیے سوائے پر خلوص دعاؤں کے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے، لیکن قیامت کے دن ہم نانا جان سے تمہاری غم گسار ہمدردیوں کا پورا پورا اصلہ دلوائیں گے۔"

رئیس نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا:

"بس تمہارا مدعا میں نے سمجھ لیا، لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم سید زادے ہو؟ لاؤ کوئی سند پیش کرو۔ آلِ رسول کا لبادہ اوڑھ کر بھیک مانگنے کا یہ ڈھونگ بہت فرسودہ ہو چکا ہے۔"

"ہو سکے تو تم کوئی دوسرا گھر دیکھو، یہاں تمہیں کوئی سہارا نہیں مل سکتا۔"

رئیس کے جواب سے یتیموں کا چہرہ اتر گیا، آنکھیں پرنم ہو گئیں، یوں ہی غریب الوطنی، یتیمی، بے کسی اور کئی دن کی فاقہ کشی نے انہیں نڈھال کر دیا تھا، اب لفظوں کی چوٹ سے دل کا نرم و نازک آبگینہ بھی ٹوٹ گیا۔

یاس کے عالم میں دونوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کی آنکھوں کا آنسو اپنی آستین میں جذب کرتے ہوئے کہا:

"پیارے! مت روؤ، گھائل ہو کر مسکرانا اور فاقہ کر کے شکر ادا کرنا ہمارے گھر کی پرانی ریت ہے۔"

دھوپ کا موسم تھا۔ قیامت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ آدمی سے لے کر چرند پرند تک سبھی اپنی اپنی پناہ گاہوں میں جا چھپے تھے، لیکن چمنستانِ فاطمی کے یہ دو کملائے ہوئے پھول کھلے آسمان کے نیچے بے یار و مددگار کھڑے تھے۔ ان کے لیے کہیں آسائش کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ دھوپ کی شدت سے جب بے تاب ہو گئے تو سامنے ایک دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے۔

یہ ایک مجوسی کا گھر تھا۔ عمارت کے رُخ سے شانِ ریاست ٹپک رہی تھی۔ تھوڑی دیر دم لینے کے بعد چھوٹے نے بڑے بھائی سے کہا:

"بھائی جان!..... جس کی دیوار کے سائے میں ہم لوگ بیٹھے ہیں، معلوم نہیں یہ کس

کا گھر ہے؟ اس نے کہیں آ کے اٹھا دیا تو اب پاؤں میں چلنے کی سکت بھی باقی نہیں ہے۔ زمین کی تپش سے تلوؤں میں آبلے پڑ گئے ہیں، کھڑا ہونا مشکل ہو رہا ہے اور آنکھوں تلے اندھیرا چھاتا جا رہا ہے۔ یہاں سے کیسے اُٹھ سکیں گے۔"

بڑے بھائی نے جواب دیا:

"ہم اس کی دیوار کا کیا نقصان کر رہے ہیں، صرف سائے میں تو بیٹھے ہیں۔ ویسے ہر شخص کا دل پتھر نہیں ہوتا پیارے۔ ہو سکتا ہے، اسے ہماری حالت زار پر ترس آ جائے اور وہ ہمیں اپنے سائے سے نہ اُٹھائے..... اور اگر اٹھا بھی دیا تو دلوں کی آبادی تنگ نہیں ہے۔ انگاروں پر چلنے والے تپتی ہوئی زمین سے نہیں ڈرتے۔ فکر مت کرو میں تمہیں اپنی پیٹھ پر لا دلوں گا۔"

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد چھوٹے بھائی نے اپنے بڑے بھائی سے نہایت معصومانہ انداز میں ایک سوال پوچھا:

"بھائی جان آپ کو یاد ہوگا۔ اس دن جب ہم لوگ جنگل میں راستہ بھول گئے تھے۔ ہر طرف آندھیوں کا طوفان اُٹھا ہوا تھا اور آسمان سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، ہم لوگوں نے پہاڑ کی ایک کھوہ میں پناہ لی تھی۔ شام تک طوفان نہیں تھما، رات ہو گئی اور ہم لوگوں کو اُسی کھوہ میں ساری رات بسر کرنا پڑی۔ آدھی رات کو جب ایک شیر چنگھاڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا، تو گھوڑے پر سوار ایک نقاب پوش بزرگ بجلی کی طرح نمودار ہوئے اور چند ہی لمحوں کے بعد غائب ہو گئے۔ وہ کون تھے؟ آج تک یہ راز آپ نے نہیں بتایا۔"

بڑے بھائی نے سوالیہ لہجے میں کہا:

"شیر کی خوفناک آواز سن کر تمہارے منہ سے چیخ نکلی تھی اور تم نے دہشت زدہ ہو کر کسی کو پکارا تھا؟ یاد کرو، بس وہ وہی تھے۔ ہمارے دل کی دھڑکنوں سے بہت قریب رہتے ہیں وہ، ہماری ذرا سی تکلیف ان سے دیکھی نہیں جاتی۔ انہیں کا خون ہماری رگوں میں بہتا ہے۔"

"ابا جان کہا کرتے تھے کہ پہلی بار جب وہ پیکر خاکی میں یہاں آئے تھے، تو ان کے چہرے سے نور کی اتنی تیز کرن پھوٹتی تھی کہ نگاہ اُٹھانا مشکل تھا۔ اب تو خاکی پیراہن بھی

نہیں ہے کہ حجاب کے اوٹ سے کوئی انہیں دیکھ لے، اس لیے اب چہرے پر خود ہی نقاب ڈال کر آتے ہیں تاکہ کائناتِ ہستی کا نظامِ زندگی درہم برہم نہ ہو جائے۔ ابا جان بھی کہا کرتے تھے کہ دیکھنے والوں نے ہمیشہ انہیں نقاب ہی میں دیکھا ہے۔ بشریت کی یہ ساری بحثیں نقاب ہی سے متعلق ہیں۔ حقیقت کا چہرہ الفاظ و بیان کی دسترس سے ہمیشہ باہر رہا ہے۔''

چشمۂ کوثر کی معصوم لہروں کی طرح سلسلۂ بیان جاری تھا اور ''گھر کا بھیدی'' گھر کا راز واشگاف کر رہا تھا کہ اتنے میں پس دیوار آواز سن کر مجوسی گھر سے باہر نکلا۔ اس کی نیند میں خلل پڑ گیا تھا۔ وہ غصے میں شرابور تھا، لیکن جوں ہی گلشن نور کے ان حسین پھولوں پر نظر پڑی، اس کا سارا غصہ کافور ہو گیا۔ نہایت نرمی سے دریافت کیا:

''تم لوگ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟''

بعینہٖ یہی سوال اس رئیس نے بھی کیا تھا اور جواب سننے کے بعد اپنے دروازے سے اُٹھا دیا تھا۔ سوال کا انجام سوچ کر چھوٹے بھائی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بڑے بھائی نے کمال تحمل کے ساتھ جواب دیا:

''ہم لوگ آل رسول ہیں، یتیم بھی ہیں اور غریب الوطن بھی ہیں۔ کئی دنوں کے فاقے سے نیم جان ہیں۔ تکلیف کی شدت برداشت نہ ہو سکی تو آج جگر کی آگ بجھانے نکلے ہیں۔ وہ سامنے والے رئیس کے گھر پر گئے تھے۔ اس نے ہمیں اپنے دروازے سے اُٹھا دیا۔ دھوپ بہت تیز ہے، زمین تپ گئی ہے، ننگے پاؤں چلتے چلتے پاؤں میں آبلے پڑ گئے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے تمہاری دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے ہیں۔ شام ہوتے ہوتے یہاں سے اٹھ جائیں گے۔''

مجوسی نے کہا:

''سامنے والا رئیس تو اُسی نبی کا کلمہ پڑھتا ہے، جس کی تم اولاد ہو۔''

قدرے توقف کے بعد بولا:

''اس نے اس رشتے کا بھی کائی خیال نہیں کیا؟''

بڑے بھائی نے جواب دیا:

"وہ یہ کہتا ہے کہ تم آل رسول ہو تو اس کا ثبوت پیش کرو۔ ہم نے ہزار اُس سے کہا کہ غریب الوطنی میں ہم کیا ثبوت پیش کر سکتے ہیں؟ تم اس کا ثبوت قیامت کے دن پر اُٹھا رکھو جب کہ نانا جان بھی وہاں موجود ہوں گے۔"

قیامت کا تذکرہ سن کر مجوسی کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس نے حیرت آمیز لہجے میں کہا:

"تمہاری پیشانیوں میں عالم قدس کا جو نور جھلک رہا ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت چاہیے تھا اسے؟ اور یہ بھی کسی کور چشم کو نہ نظر آئے تو قدموں کے نیچے بچھ جانے کے لیے "اپنے رسول" کا نام ہی کیا کم ہے کہ آخرت کی سرفرازی کا دار و مدار تو نسبت کی توقیر پر ہے، نسبت نہ بھی واقعہ کے مطابق ہو، جب بھی جزا کا استحقاق کہیں نہیں جاتا۔ دل کی نیت بخیر ہے تو اس کی راہ کی ٹھوکر بھی لائق تحسین ہے۔

بہر حال میں تمہارے نانا جان کا کلمہ گو تو نہیں ہوں، لیکن ان کی پاکیزہ اور باعظمت زندگی سے دل ہمیشہ متاثر رہا ہے۔ ان کی نسبت سے تم نونہالوں کے لیے اپنے اندر ایک عجیب کشش محسوس کر رہا ہوں۔

ویسے ایک باعظمت رسول کے ساتھ نہ بھی تمہارا نسبی تعلق ہوتا، جب بھی تمہاری یتیمی، غریب الوطنی اور اس کے ساتھ یہ تمہارا معصوم چہرہ دلوں کو پگھلا دینے کے لیے کافی ہے۔ اب تم ایک معزز مہمان کی طرح میرے گھر کو اپنے قدموں کا اعزاز مرحمت کرو اور جب تک اطمینان بخش صورت نہ پیدا ہو جائے، اس گھر سے کہیں جانے کا قصد نہ کرو۔"

اس کے بعد مجوسی رئیس دونوں بچوں کو اپنے ہمراہ گھر کے اندر لے گیا اور بیوی سے کہنے لگا۔

دیکھو! نازوں کے پلے ہوئے یہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے شہزادے ہیں۔ ان کے گھر کی چوکھٹ کا اقبال تمہیں بھی معلوم ہے۔ چارہ گری اور فیض بخشی میں ان کا آستانہ ہمیشہ سے دردمندوں کی کائنات کا مرکز رہا ہے۔ وہ واقعہ تمہیں یاد ہوگا، جب کہ تمہاری گود خالی تھی۔ گھر اندھیرا تھا۔ ایک چراغ آرزو کی تمنا میں کتنی بار تمہاری پلکیں بوجھل ہو چکی تھیں، بالآخر

اضطراب شوق میں ایک دن ہم دونوں گھر سے نکل پڑے اور کئی ہفتے کی راہ طے کر کے ایک گاؤں میں پہنچے تھے۔

جس خواجۂ کارساز کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر تمہیں ایک ''لخت جگر'' کی بشارت ملی تھی، معلوم ہے تمہیں، وہ کون سی جگہ تھی؟.... وہ انہی شہزادوں کے خانوادے کی ایک دل نواز بارگاہ تھی۔

لیکن یہ بھی وقت کا ماتم ہے بیگم.... کہ لالہ کا جگر جن کے کف پا کی ٹھنڈک سے شاداب رہا ہے، آج وہ کانٹوں کی نوک سے گھائل ہیں اور جن کی پلکوں کے سائے میں یہ جہان خاکی چین کی نیند سوتا ہے، آج وہ خود دیواروں کا سایہ تلاش کر رہے ہیں۔

میری بیگم! ان کے بزرگوں کا احسان تمہیں یاد نہ ہو، جب بھی کم از کم اتنا ضرور یاد رکھنا کہ یتیموں کی ناز برداری اور بے سہارا بچوں کی دلجوئی انسانی اخلاق کا بہت ہی دل کش نمونہ ہے۔

مجوسی کی بیوی ایک رقیق القلب عورت تھی۔ ذرا سی دیر میں اُس کی ممتا جاگ اٹھی۔ جذبۂ بے اختیار میں دونوں بھائیوں کو اپنے قریب بٹھا لیا۔ سر پر ہاتھ پھیرا نہلایا، کپڑے بدلوائے، بالوں پہ تیل رکھا، آنکھوں میں سرمہ لگایا اور بنا سنوار کر شوہر کے سامنے لائی۔

فاطمی شہزادوں کی بلائیں لیتے ہوئے اس کے یہ رقت انگیز الفاظ ہمیشہ کے لیے گیتی کے سینے میں جذب ہو گئے:

'' ذرا دیکھیے! یہ کالی گھٹاؤں کی طرح کاکل.... یہ چاند کی طرح درخشاں پیشانی.... یہ نور کی موجوں میں نکھرا ہوا چہرہ...... یہ پروئے ہوئے موتیوں کی طرح دانتوں کی قطار.... یہ پھولوں کی پنکھڑی کی طرح پتلے پتلے ہونٹ.... یہ گل ریز تبسم.... یہ گہر بار تکلم...... یہ رحمتوں کا سویرا .... یہ سرمگیں آنکھیں..... یہ معصوم اداؤں کا چشمۂ سیال..... سچ بتایئے، کیا یتیموں کی یہی سج دھج ہوتی ہے؟ خبردار آج سے میرے ان جگر پاروں کو جو یتیم کہے گا، میں اس کا منہ نوچ لوں گی۔''

ان کے گھر کا بخشا ہوا ایک چراغ پہلے ہی سے گھر میں تھا، دو چراغ اور آ گئے۔ جس گھر میں تین چراغوں کا نور برستا ہو، وہ خاکیوں کا گھر نہیں ہے، وہ ستاروں کی انجمن ہے۔

پیار کی ٹھنڈی چھاؤں میں پہنچ کر کملائے ہوئے پھول پھر سے تازہ ہو گئے۔ دونوں بھائی سارا غم بھول گئے۔ اب جسم کا بال بال اور خون کا قطرہ قطرہ ان غمگسار شفقتوں کے لیے دعا کی زبان بن چکا تھا۔

آج مسلمان رئیس کی قسمت کا آفتاب گہن میں آ گیا تھا۔ وہ بھی جلد سو گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد گھبرا کے اُٹھ بیٹھا اور سر پیٹنے لگا۔ گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ سب لوگ ارد گرد جمع ہو گئے۔

رئیس کی بیوی اس کی حالت دیکھ کر بدحواس ہو گئی گھبراہٹ میں پوچھا:

"کیا کہیں تکلیف ہے؟........معالج کو بلائیں......جلد بتائیے؟"

کچھ جواب دینے کی بجائے وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگا:

"ارے میں لٹ گیا۔ تباہ ہو گیا۔ میری مٹی برباد ہو گئی۔ کلیجہ شق ہوا جا رہا ہے۔ قیامت کی گھڑی آ گئی۔ ہر طرف اندھیرا ہے۔ ہائے میں لٹ گیا.........ہائے میں لٹ گیا.......!

یہ کہتے کہتے اس پر غشی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اُسے ہوش آیا، تو بیوی نے روتے ہوئے کہا:

"جلد بتائیے کیا قصہ ہے؟.....میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔"

رئیس نے بڑی مشکل سے رُکتے رُکتے جواب دیا:

"ہائے! میں لٹ گیا۔ اپنی تباہی کا قصہ کیا بتاؤں تم سے؟"

"آج کا واقعہ تمہیں معلوم ہی ہے کہ کتنی بے دردی کے ساتھ میں نے ان معصوم سیدزادوں کو اپنے دروازے سے دُھتکارا تھا۔ ہائے افسوس! اس وقت میری عقل کو کیا ہو گیا تھا۔"

ابھی آنکھ لگتے ہی اس واقعہ کے متعلق میں نے ایک نہایت بھیانک اور ہولناک خواب دیکھا ہے کہ میں ایک نہایت حسین اور شاداب چمن میں چہل قدمی کر رہا ہوں۔ اتنے میں ایک ہجوم دوڑتا ہوا میرے قریب سے گزرا۔ میں نے لپک کر دریافت کیا کہ آپ لوگ اتنی تیزی کے ساتھ کہاں جا رہے ہیں؟

ان میں سے ایک شخص نے بتایا کہ باغ فردوس کا دروازہ کھول دیا گیا اور ایک اعلان کے ذریعہ اُمت محمدی کو داخلے کی عام اجازت دے دی گئی ہے۔

یہ سن کر میں خوشی سے ناچنے لگا اور ہجوم کے ساتھ شامل ہوگیا۔ باغ فردوس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک ایک کر کے لوگ داخل ہو رہے تھے۔

میں بھی آگے بڑھا اور جوں ہی دروازے کے قریب پہنچا، جنت کے پاسبان نے مجھے روک دیا۔ میں نے کہا کہ مجھے کیوں روکا جا رہا ہے؟ آخر میں بھی سرکار ﷺ کا امتی ہوں۔

اس نے حقارت آمیز لہجے میں جواب دیا:

''تم امتی ہو تو اپنے امتی ہونے کا ثبوت دو...... سند پیش کرو۔ اس کے بعد ہی تمہیں جنت میں داخلے کی اجازت مل سکے گی۔ بغیر ثبوت لیے اگر نبی زادوں کو تم اپنے گھر میں پناہ نہیں دے سکتے تو تمہیں بغیر ثبوت کے جنت میں داخلے کی اجازت کیونکر مل سکتی ہے۔''

''اب تم سے بات رحم و کرم کی نہیں ہوگی، ضابطے کی ہوگی۔ انجام سے مت گھبراؤ، اس سلسلے کا آغاز تم نے ہی کیا ہے۔ جاؤ محشر کی تپتی ہوئی زمین پر چہل قدمی کرو، یہاں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔''

جب سے یہ ہولناک خواب دیکھا ہے، انگاروں پر لوٹ رہا ہوں۔ میرے تئیں یہ خواب نہیں ہے، امر واقعہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قیامت کے دن یہ واقعہ میرے ساتھ پیش آ کر رہے گا۔

ہائے! میں سرمدی نعمتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا۔ قہر الٰہی کی زد سے جو مجھے بچا سکتا تھا، اسی کو میں نے آزردہ کر لیا ہے۔ اب کون میری چارہ سازی کرے گا؟

بیوی نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا:

''آپ اپنی جان مت ہلکان کیجیے، خدا بڑا غفور ہے، رحیم ہے۔ اس کے دربار میں رویئے تڑپئے، فریاد کیجیے، توبہ کا دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے۔ وہ آپ کی خطا ضرور معاف کر دے گا۔ آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ خدا کی رحمتوں سے ناامید ہونا مسلمانوں کا نہیں، کافروں کا شیوہ ہے۔''

رئیس نے کراہتے ہوئے جواب دیا:

"تمہاری عقل کہاں مرگئی ہے؟ ہوش کی بات کرو۔ خدا کا حبیب صلی اللہ علیہ وسلم جب تک آزردہ ہے، ہم لاکھ فریاد کریں، رحمت وکرم کا کوئی دروازہ ہم پر نہیں کھل سکتا۔"

خدا کی رحمت ہمیشہ اپنے محبوب کا تیور دیکھتی ہے۔ محبوب کی نظر سے گرنے والا کبھی نہیں اٹھ سکا ہے۔

صد حیف! جو ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ سکتا ہے، آج اسی کے گھر کا آبگینہ میں نے توڑ دیا۔ وہ نہ بھی اپنی زبان سے کچھ کہے، جب بھی مشیت الٰہی بہر حال اس کی طرف دار ہے۔ وہ مجھے ہرگز معاف نہیں کرے گا۔

بیوی کی آواز مدھم پڑ گئی اور اس نے دبے دبے لہجے میں کہا:

"پھر پہلے خدا کے حبیب ہی کو راضی کر لیا جائے۔ ابھی شہزادے شہر سے باہر نہیں گئے ہوں گے۔ صبح سویرے ہی انہیں تلاش کریں اور جس طرح بھی ہو، منت سماجت کر کے منا کر انہیں گھر لائیں۔ وہ اگر راضی ہو گئے اور انہوں نے آپ کو معاف کر دیا، تو خدا کا حبیب بھی راضی ہو جائے گا۔ اس کے بعد آسانی سے رحمت یزدانی کی توجہ حاصل کی جا سکے گی۔"

بیوی کی یہ بات سن کر رئیس کا چہرہ کھل گیا، جیسے نگاہوں کے سامنے امید کی کوئی شمع جل گئی ہو۔ اتنی دیر کے بعد اب اسے اپنی نجات کا ایک موہوم سہارا نظر آیا تھا۔

آج صبح ہی سے مجوسی کے گھر پر مردوں، عورتوں اور بچوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ جذبۂ شوق کے عالم میں وہ بے تحاشہ گھر کی دولت لٹا رہا تھا۔

سارے شہر میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی تھی کہ خاندان رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو شہزادے اس کے گھر مہمان ہیں۔

مسلمان رئیس اپنی بیوی کے ہمراہ ان کی تلاش میں جوں ہی گھر سے باہر نکلا، مجوسی کے دروازے پر لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر حیران رہ گیا۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ خاندانِ رسالت کے دو نونہال کل سے یہاں مقیم ہیں۔ پروانوں کا یہ ہجوم ان ہی کے اعزاز میں اکٹھا ہوا ہے۔

یہ خبر سنتے ہی رئیس کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے دل ہی دل میں طے کرلیا کہ مجوسی کو بچوں کے معاوضے میں چاہے زندگی بھر کی کمائی دینی پڑے، قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں گا، بگڑی ہوئی تقدیر سنور گئی تو دولت کمانے کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔

نہایت تیزی کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے رئیس اور اس کی بیوی دونوں مجوسی کے گھر پہنچے۔ دیکھا تو دونوں شہزادے دولہے کی طرح بن سنور کر بیٹھے ہیں اور مجوسی ان کے سروں سے اشرفیاں اتار کر مجمع کو لٹا رہا ہے۔

رئیس نے آگے بڑھ کر مجوسی سے کہا:

''مجھے آپ سے ایک نہایت ضروری کام ہے۔ ایک لمحے کے لیے توجہ فرمائیں۔''

مجوسی، رئیس کی طرف متوجہ ہوگیا:

''فرمایئے میرے لائق کیا خدمت ہے؟''

رئیس نے اپنی نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا:

''یہ دس ہزار اشرفیوں کا توڑا ہے، اسے قبول فرمایئے اور یہ دونوں شہزادے میرے حوالے کردیجیے۔ مجھے حق بھی پہنچتا ہے کہ سب سے پہلے یہ میرے ہی غریب خانے پر تشریف لائے تھے۔''

مجوسی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

''فردوس کی جو عالی شان عمارت آپ نے دیکھی ہے اور جس میں داخل ہونے سے آپ کو روک دیا گیا، کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں دس ہزار اشرفیوں میں اسے فروخت کردوں اور زندگی میں پہلی بار رحمت یزدانی کا جو دروازہ کھلا ہے، اپنے اوپر مقفل کرلوں۔''

شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ جس خواجۂ کونین کو آزردہ کرکے اپنے اوپر جنت حرام کرلی ہے، رات کو ان کے جلوہ بارتبسم سے ہمارے دلوں کی کائنات روشن ہوچکی ہے۔

اے خوشا نصیب! کہ اب ہمارے گھر میں کفر کی شب دیجور نہیں ہے، بلکہ ایمان اور اسلام کا سویرا ہوچکا ہے۔

یاد کیجیے،.....خواب کی وہ بات، جب آپ جنت کے پاسبان سے کہہ رہے تھے کہ

"آخر میں بھی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہوں"، مجھے کیوں روکا جارہا ہے؟ تو میں اس وقت اپنے چھوٹے سے کنبے کے ساتھ جنت کے صدر دروازے سے گزر رہا تھا۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ میں بھی سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہوں۔ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی کروڑوں کی بھیڑ میں پہچان لیا گیا۔ وہاں زبان کی بات نہیں چلتی، دل کا آئینہ پڑھا جاتا ہے میرے بھائی!

ہمارے حال پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت ونوازش کا اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز منظر دیکھنا چاہتے ہو، تو اپنی اہلیہ کو اندر بھیج دیجیے۔ حضرت سیدہ کی کنیز شکرانے کی نماز ادا کر رہی ہے۔ غالباً وہ ابھی سجدے میں ہوگی۔ سر اٹھانے کے بعد ذرا اس کی دمکتی ہوئی پیشانی کا نظارا کرلیں۔ عالم خواب میں جس حصے پر سیدہ نے اپنا دست شفقت رکھ دیا تھا، وہاں اب تک چراغ جل رہا ہے۔ کرن پھوٹ رہی ہے اور در و دیوار سے نور برس رہا ہے۔

جن شہزادوں کے دم قدم سے ہمارے نصیب چمکے، دلوں کی انجمن روشن ہوئی، جیتے جی سرمدی امان کا پروانہ ملا اور ایک رات میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے، آپ انہیں دس ہزار اشرفیوں میں خریدنا چاہتے ہیں؟ حالانکہ صبح سے اب تک میں دس ہزار اشرفیاں صرف ان کے اوپر نثار کر چکا ہوں۔

اب وہ میرے مہمان نہیں ہیں، گھر کے مالک ہیں۔ ہم خود ان کے حوالے ہیں، انہیں کسی کے حوالہ کیا کر سکتے ہیں؟

بھائی جان! آپ کا یہ سارا جوش عقیدت رات کے خواب کا نتیجہ ہے، خواب سے پہلے آنکھ کھل گئی ہوتی تو بات بن سکتی تھی۔ اب اس کا وقت گزر چکا ہے۔ البتہ ماتم کا وقت اب بھی باقی ہے، وہ کبھی نہیں گزرے گا۔

رئیس سر جھکائے ہوئے باتیں سن رہا تھا اور روتے روتے اس کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔

بڑے بھائی کی نظر جوں ہی اس کی طرف اٹھی، دل جذبۂ رحم سے بھر آیا۔۔۔۔۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

''بڑے سے بڑے غم کا بار سہ لیا ہے، لیکن بھیگی ہوئی پلکوں کا بوجھ ہم سے کبھی نہیں اُٹھ سکے گا۔ تم نے ہمارے ساتھ جو کچھ بھی کیا، وہ تمہارا شیوہ تھا، لیکن ہم تمہارے ساتھ اپنے گھر کی ریت برتیں گے۔ جاؤ تمہیں ہم نے معاف کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ نانا جان بھی معاف کر دیں گے۔ مایوسی کا غم نہ اٹھاؤ۔ جنت میں تم بھی ہمارے ساتھ رہو گے۔''

یہ مژدۂ جاں فزا سننے کے بعد رئیس کا دل خوشی سے ناچ رہا تھا۔